وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور اگر ہم ان پر فرشتے اتارتے اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور سب چیزوں کو ان کے سامنے لا اکٹھا کرتے وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے۔ مگر یہ کہ اللہ چاہتا لیکن ان میں سے اکثر جاہل ہیں۔ (1001)

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى

اور اسی طرح ہم نے ہر ایک نبی کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن بنایا۔ وہ دھوکا دینے کے

1001 - قُبُلًا۔ بعض نے اسے قَابِلٌ کی جمع کہا ہے اور اس کے معنی ہیں ان کے حواس کے مقابل یا سامنے ﴿اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا﴾ [الکھف: 55:18] ''یا عذاب ان کے سامنے آموجود ہو'' اور بعض نے قَبِيْلٌ کی، جس کے معنی جماعت ہیں۔ یعنی جماعت جماعت کر کے سب چیزوں کو لے آتے ہیں۔ (غ)

معجزات کے باوجود ایمان نہ لانے والے: پچھلے رکوع میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کر کے خاتمہ اس آیت پر کیا تھا کہ جن لوگوں نے کھلے کھلے دلائل کو رد کر دیا ہے اور معجزات کے طالب ہیں وہ معجزات کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ جیسے دلائل سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور قوت متفکرہ سے کام نہ لیا، ایسا ہی معجزات کے وقت ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر وہ موٹے موٹے نشان بھی ظاہر ہو جائیں جو یہ مانگتے رہتے ہیں تو بھی قساوت قلبی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جن لوگوں نے مخالفت کی ٹھان لی ہے وہ کبھی نہ مانیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قوائے روحانی بالکل مردہ ہو جاتے ہیں۔ پس معجزات دیکھ بھی لیں تو محض ایک عجوبہ دیکھ لینے سے قوائے روحانی زندہ نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں سب لوگوں کا ذکر نہیں۔ بلکہ صرف ان لوگوں کا ہی ہے جو مخالفت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ٹھان لیتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ حق کو قبول نہ کریں گے بلکہ اس کی مخالفت کریں گے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ایسے لوگوں کو شیاطین کے نام سے موسوم کیا ہے۔

کلام موتیٰ سے مراد:

ہاں ﴿اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ کے لفظ آخر پر لا کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ گو اس قسم کے معجزات سے تو نہیں مگر اور اسباب سے جو اللہ تعالیٰ پیدا کر دے گا، لوگ مانیں گے بھی۔ فرشتے بھی آئے [دیکھو نمبر: 269] اور مُردوں نے بھی ان سے کلام کیا۔ یعنی بہت سے لوگ جو قوائے روحانی کے لحاظ سے مر چکے تھے ان کو خدا نے زندہ کر کے ایک روشنی عطا کی۔ اگلے رکوع کی پہلی آیت کہ ایک شخص مردہ ہو ہم اسے زندہ کر دیں اور اس کو نور دے دیں تو وہ اس کی طرح نہیں جو اندھیروں میں ہے۔ اور یا پہلی کتابوں کی شہادت کلام موتیٰ ہے اور ہر چیز کے سامنے آ جانے سے ان کی سزا کے سب سامانوں کا اکٹھا ہو جانا مراد ہے۔

بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے سو ان کو چھوڑ دے اور اسے جو وہ افترا کرتے ہیں۔ (1002)

وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل جھکے رہیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور تاکہ وہ اس پر راضی ہو جائیں اور تاکہ کیے جائیں جو وہ کر رہے ہیں۔ (1003)

1002 - يُوْحِيْ۔ وَحِيٌ سے مراد یہاں اس کے اصل معنی اشارہ سریعہ کے ہیں یا دل میں ڈالنا اور ان کی وسوسہ اندازی کی طرف اشارہ ہے۔

زُخْرُفَ زینت کو کہتے ہیں جو ملمع یا نقش ونگار سے ہو اور ﴿زُخْرُفَ الْقَوْلِ﴾ ملمع کی بات ہے۔ (غ) یعنی جو اوپر سے اچھی نظر آتی ہو مگر اس کا انجام زیاں ہو۔

لفظ كَذٰلِكَ میں پچھلی آیت کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی جس طرح تمہارے مقابل پر یہ دشمن ہیں جو کھلے کھلے نشانوں اور واضح دلائل کو قبول نہیں کرتے۔ ایسا ہی پہلے انبیاء علیہم السلام کے مقابل میں بھی ہوتے رہے۔ ﴿شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ﴾ سے مراد انسانوں میں سے سرکش لوگ ہیں۔ جن شیطان وہ ہے جو نظر سے مخفی ہے مگر انسان جب دوسرے کا شیطان بنتا ہے تو جن سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے کیونکہ جن صرف وسوسہ اندازی کرتا ہے اور یہ باتوں سے اور عمل سے ترغیب دیتا ہے۔ ﴿مَا يَفْتَرُوْنَ﴾ میں بتا دیا کہ یہ افترا کرنے والے یعنی انسان ہی ہیں۔ کیونکہ اصل فعل انہی کا ہے اور دوسری جگہ صرف یوں فرمایا ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ [الفرقان: 31:25] ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن بنائے۔'' پس ﴿شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ سے یہاں مراد مجرم ہی ہیں دیکھو اگلا نوٹ۔

1003 - تَصْغٰى۔ صَغَوْا سے ہے مائل ہونا۔ [صَغَتِ الشَّمْسُ] کے معنی ہیں سورج غروب کی طرف مائل ہوا۔ (غ) اِلَيْهِ میں ضمیر ﴿زُخْرُفَ الْقَوْلِ﴾ یعنی ملمع کی باتوں کی طرف ہے یا شیاطین کی وحی کی طرف یا عداوت کی طرف۔

يَقْتَرِفُوْا۔ قَرَفَ اور اِقْتِرَافٌ اصل میں یہ ہے کہ درخت کی چھال اتار دی جائے۔ استعارۃً اکتساب کے معنی میں آتا ہے اچھا ہو یا برا۔ (غ)

جن شیطان سے مراد:

یہ آیت عطف ہے غُرُوْرًا پر۔ یعنی وہ ملمع کی باتیں جو ایک دوسرے کے دل میں ڈالتے ہیں وہ محض دھوکہ دینے کے لیے ہوتی

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

تو کیا میں اللہ کے سوائے فیصلہ کرنے والا تلاش کروں اور وہ وہی ہے جس نے تمہاری طرف واضح کتاب اتاری اور وہ جن کو ہم نے کتاب دی جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتاری گئی ہے۔ سو تو جھگڑنے والوں میں سے نہ ہو۔ (1004)

ہیں۔ اور اس غرض کے لیے کہ عام لوگ، جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، اعمال کی جزا سزا کو نہیں جانتے ان کے دل ان ملمع کی باتوں کی طرف مائل ہو جائیں اور وہ ان کو پسند کرنے لگیں اور ایسے ہی کام کرنے لگیں جیسے وہ شیطان یعنی ان کے سردار خود کرتے ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیاطین صرف ان کے سردار ہیں جو پہلے خود حق کے دشمن بنتے ہیں پھر آہستہ آہستہ اپنے پیروؤں کو بھی اس پر راضی کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پیرو بھی تمام وہ شرارت کی باتیں کرنے لگتے ہیں جو ان کے سردار کرتے ہیں۔ اور یہاں بالخصوص انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد صرف اعدائے حق انسان ہیں۔ گو ان پر عام نظروں سے مستور ہونے کی وجہ سے جن کا لفظ بھی بولا گیا ہو، جیسا کہ مجاز کے رنگ میں ایک شاعر اپنی محبوبہ کو جنی کے نام سے پکارتا ہے [وَيْحَكَ يَا جِنِّيَّةُ]۔ اگر سارے مضمون پر ایک یکجائی نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ بھی شبہ نہیں رہتا۔ اس رکوع کے آخر پر [آیت نمبر: 121] میں پھر شیاطین (یعنی سرداروں) کے اپنے اولیاء کو وحی کرنے کا ذکر ہے اور [آیت نمبر: 123] میں كَذٰلِكَ لفظ لا کر اور انہی لوگوں کو ﴿اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا﴾ کہہ کر بالکل واضح کر دیا کہ ﴿شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ﴾ سے مراد مجرموں کے سردار ہیں نہ کچھ اور۔

1004 - مُفَصَّلٌ۔ فَصْلٌ کے معنی ہیں دو چیزوں کا ایک دوسرے سے الگ کر دینا۔ (غ) اور تفصیل کے معنی تبیین (ل) یا کھول کر بیان کرنا ہیں اور یہاں مراد ہے کہ جس بارہ میں میرا اور تمہارا جھگڑا ہے اسے کھول کر یہاں بیان کر دیا گیا ہے۔ (غ)

مذہبی اختلافات میں کوئی شخص حَکَم نہیں بنایا جا سکتا:

چونکہ قرآن کریم بار بار پہلے انبیاء علیہم السلام کی شہادت کی طرف توجہ دلاتا تھا اس لیے مشرک یہ حیلہ کرتے تھے کہ یہودی یا عیسائی ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم بن جائیں۔ آج بھی بعض لوگ مسائل دینی میں بحث کرتے ہیں تو کہتے ہیں فلاں شخص کو حَکَم بنا لیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ اس شخص کا فیصلہ مبرا عن الخطا ہے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ جب کتاب مفصل ہے یعنی اس کے اندر دعاوی بھی ہیں اور دلائل بھی تو پھر دوسرے کو حکم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے دعاوی اور دلائل پر غور کر کے خود ہی فیصلہ کر لو۔ یہاں **مفصل سے مراد** یہ نہیں کہ تمام فروعات دین اس کے اندر تفصیل سے موجود ہیں بلکہ اصل مضمون جو اثبات توحید و رسالت پر ہے جس میں جھگڑا ہو رہا ہے اسی کے دعاوی اور دلائل کے کھول کر بیان کرنے کا ذکر ہے۔ اور آخری حصہ میں اہل کتاب کا ذکر کیا کہ وہ اس

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف میں کمال کو پہنچ گئی کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (1005)

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور اگر تو اکثر ان لوگوں کی بات مانتا چلا جائے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں۔ وہ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور وہ محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں۔ (1006)

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

تیرا رب اس کو خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے گمراہ ہوتا ہے اور وہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

سو اس سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کی باتوں پر ایمان لانے والے ہو۔ (1007)

بات کے گواہ ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا نزول حق کے ساتھ ہے کیونکہ ان کی کتابوں میں اس کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔

1005 - **دعاوی اور دلائل کا قرآن میں ہونا:** پچھلی آیت کے مضمون کو اور واضح کیا ہے۔ وہاں کتاب کو مفصل کہا تھا یہاں بتا دیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ صدق وعدل میں یہ کتاب اس حد کمال کو پہنچ گئی ہے کہ اپنے سے باہر کسی چیز کی محتاج نہیں رہی۔ اتمام کے اس معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 787]۔ صدق میں اشارہ اس کے دعاوی کی سچائی کی طرف ہے اور عدل میں اس کے دلائل کے حق ہونے کی طرف۔ چونکہ احکام دینی میں فروع دین اس کے اصول سے مستنبط ہوتے ہیں اس لیے سارے فروع کا اس کے اندر تفصیل سے نہ ہونا خلاف اتمام نہیں ہاں اصول سب ضروری ہے کہ اس کے اندر مفصل ہوں یعنی دعاوی بمع اپنے دلائل کے ہوں۔

﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ میں ذکر انہی کلمات کا ہے جن کا ذکر ﴿تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ﴾ میں ہے یعنی مراد اس سے قرآن شریف ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کلام اس کمال کو پہنچ گیا کہ اب اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یعنی کوئی شخص اس کلام کی جگہ صدق وعدل کے لحاظ سے بہتر کلام نہیں لا سکتا۔ اور یہ **دنیا کی آخری مذہبی کتاب** ہے۔

1006 - یہاں بتا دیا کہ پیروی علم صحیح کی کرنی چاہیے۔ اٹکل پچو اور ظنی باتیں کرنے والے گو تعداد میں بہت ہوں مگر پیروی ان کی نہیں چاہیے بلکہ علم کی یعنی دلائل کی کرنی چاہیے۔

1007 - قرآن کریم نے توحید پر یہاں تک زور دیا ہے کہ جن غذاؤں کا تعلق مشرکانہ افعال سے ہے ان کو بھی حرام کر دیا ہے۔ اسی کی طرف

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور تمہارا کیا عذر ہے کہ تم اس سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے؟ اور اس نے تم کو کھول کر بتا دیا ہے وہ جو تم پر حرام کیا سوائے اس کے جس کے لیے تم لاچار ہو جاؤ اور یقیناً بہت سے اپنی گری ہوئی خواہشات سے لاعلمی کے ساتھ گمراہ کرتے ہیں۔ تیرا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور کھلے اور چھپے گناہ کو چھوڑ دو۔ جو لوگ گناہ کماتے ہیں اُن کو ضرور اس کے موافق بدلہ دیا جائے گا جو وہ کماتے ہیں۔ (1008)

وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع 14 11 1

اور اس سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور یہ یقیناً نافرمانی ہے اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے رہیں اور اگر تم ان کی بات مانو گے تو یقیناً تم مشرک ہو۔ (1009)

یہاں اشارہ ہے۔

1008 - **ظاہری اور باطنی گناہ:** غذاؤں کی حلت و حرمت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ کھلے اور چھپے دونوں گناہوں سے بچو۔ یہ نہ ہو کہ باطنی احکام کی طرف متوجہ ہو تو احکام ظاہری کی پروانہ کرو یا کھلے گناہوں سے بچو تو مخفی طور پر ان کا ارتکاب کر لو۔ عرب کے لوگ اس بات کو عیب نہ جانتے تھے کہ چھپ کر کوئی گناہ کر لیا جائے مثلاً چھپ کر زنا کر لینے میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ ہاں ظاہر طور پر اس کے ارتکاب کو برا خیال کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حالت آج یورپ کی ہے اور قرآن کریم کا نزول جس طرح عرب کے لیے ہوا اسی طرح آج یورپ کے لیے یہ نزول ہے۔

1009 - یہ آیت اس بات کو بالصراحت بیان کرتی ہے کہ جس چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا جائز نہیں۔ پس **ذبیحہ اہل کتاب** اسی حد تک جائز ہے کہ وہ اس پر خدا کا نام لیں۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

اور کیا وہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا اور اسے روشنی دی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلے اس شخص کی مانند ہے جس کی مثال یہ ہے کہ وہ اندھیرے میں ہے اس سے نکلتا نہیں۔ اسی طرح کافروں کو وہ کام اچھے معلوم ہوتے ہیں جو وہ کرتے ہیں۔ (1010)

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور اسی طرح ہم نے ہر ایک بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو بنایا تا کہ وہ اس میں منصوبے کریں۔ اور وہ منصوبے نہیں کرتے مگر اپنی ہی جانوں کے ضرر کے لیے اور وہ محسوس نہیں کرتے۔ (1011)

آخر آیت میں پھر دشمنان دین کی طرف اشارہ کر کے اس رکوع کے اور اگلے رکوع کے اصل مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

1010 - مَيْت۔ مَوْتٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 79]۔ مَيْتٍ مَيِّتٌ سے مخفف ہے اور یہاں مردہ ہونے سے مراد جہالت ہے اور ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ [الزمر: 30:39] ''تو بھی مرنے والا ہے وہ بھی مرنے والے ہیں۔'' میں میت سے مراد بعض کے نزدیک روح کا جسم سے الگ ہونا ہے اور بعض کے نزدیک محض تحلیل اور کمی ہے جو ہر آن واقع ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ انسان جب تک اس دنیا میں ہے ہر آن اس پر ایک موت وارد ہوتی رہتی ہے۔ جیسا شاعر کہتا ہے [يَمُوْتُ جُزْءًا فَجُزْءًا] (غ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہاں مَيْتٍ کے معنی کافر، ضال۔ اَحْيَاءٌ سے مراد ہدایت۔ نُوْرٌ سے قرآن مروی ہیں۔ (ر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مُردوں کو زندہ کرنا:

اسلام کے خلاف منصوبہ بازی کرنے والوں کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے پہلے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ساتھ ان لوگوں کو جن کے قوائے روحانی مر چکے ہیں کس مقام پر پہنچائے گا، وہ نہ صرف ان کو زندگی عطا فرمائے گا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کو ایک نور بھی عطا فرمائے گا اور وہ بھی صرف اپنی ذات کے لیے نہ ہوگا بلکہ دوسرے لوگوں میں اس کو لے کر چلیں گے یعنی اوروں کو بھی فائدہ پہنچائیں گے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی کا کمال تھا جس نے مردگی کی حالت سے اٹھا کر ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ اس کے مقابل ان لوگوں کا ذکر کیا جو تاریکی میں رہتے ہیں اور نور ایمان سے متمتع نہیں ہوتے اور پھر اس تاریکی سے اس قدر پیار کرتے ہیں کہ اس میں سے باہر نہیں نکلتے۔ گویا ان کو اپنے بدعمل ہی بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

1011 - اَكَابِرٌ۔ كَبِيْرٌ کی جمع ہے جس کے معنی رئیس یا سردار ہیں ﴿اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ﴾ [طٰهٰ: 71:20] ''یقیناً وہ بڑا

وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہم کو اس کی مثل دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں اپنی رسالت کو رکھے؟[1012] ان لوگوں کو جنہوں نے جرم کیے اللہ کی طرف سے ذلت اور سخت عذاب پہنچ کر رہے گا۔ اس لیے کہ وہ منصوبے کرتے تھے۔[1013]

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ

سو جسے اللہ ارادہ کرتا ہے کہ ہدایت دے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کے لیے ارادہ کرتا ہے کہ

ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔''

یعنی جس طرح ان کو اپنے بدعمل بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں اسی طرح پھر ان کو حق کے خلاف منصوبہ بازی سوجھتی ہے۔ تاریکی سے پیار کرنے والے کبھی روشنی کو پسند نہیں کر سکتے، اس لیے جب وہ نور دنیا میں آتا ہے اس کے بجھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ مگر آل ان منصوبہ بازیوں کا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔

1012 - **رسالت موہبت ہے:** آیت سے مراد یہاں عام ہے کوئی حکم الٰہی، کوئی شریعت یا کوئی رسول آتا ہے تو بجائے اس کے کہ ایک حق بات کو قبول کریں یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ پیغامبری کا منصب ہم کو کیوں نہ ملا؟ دوسری جگہ آتا ہے: ﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً﴾ [المدثر: 52:74] ''بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیئے جائیں۔'' اس کا جواب دیا ہے کہ خدا پیغامبری کے منصب پر ہر کس و ناکس کو ممتاز نہیں فرمایا کرتا۔ تاریکی کے فرزندوں کو وہ پیغامبری دے دے تو پھر دنیا کی اصلاح کیا ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا پیغمبر جن لوگوں کو بناتا ہے وہ اس منصب کے لیے خاص اہلیت رکھتے ہیں جس سے دوسرے عاری ہوتے ہیں۔ اسی سے عصمت انبیاء پر بھی دلیل پیدا ہوتی ہے اور اس بات پر بھی کہ منصب رسالت کسی کو کوشش سے یا دعا سے نہیں ملتا۔ بلکہ یہ ایک امر وہبی ہے جسے خدا چاہتا ہے دیتا ہے۔

1013 - صَغَارٌ سے مراد ذلت ہے عِنْدَ اللّٰهِ اکثر مفسرین کے نزدیک مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے ہم معنی ہے یعنی اللہ کی طرف سے ان کو ذلت پہنچے گی۔ اللہ کے ہاں بھی اگر معنی کیے جائیں تو مراد یہی ہے۔ منصوبہ بازیوں اور مخالفتوں کا انجام بتایا ہے کہ ذلیل ہو جائیں گے اور قوت و شوکت جس کے بل بوتے پر یہ کچھ کر رہے ہیں جاتی رہے گی۔ یہی اہل مکہ کا انجام ہوا، یہی اب مخالفت کا انجام ہوگا۔

يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

اس کو گمراہی میں چھوڑ دے اس کا سینہ تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ اوپر کو چڑھ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ ان لوگوں پر ناپاکی رہنے دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ (1014)

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور یہ تیرے رب کا سیدھا رستہ ہے ہم نے باتیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اُن کے لیے اُن کے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا دوست ہے ان (اعمال) کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَ

اور جس دن ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں میں سے بہت سے لے لیے۔ اور انسانوں

1014 - ﴿يَشْرَحْ صَدْرَهٗ﴾ شرح کے اصل معنی بسط یا پھیلانا ہیں اور شرح صدر کے معنی امام راغب نے کیے ہیں الٰہی نور اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت اور اطمینان کے ساتھ قلب میں وسعت پیدا ہو جانا۔

﴿يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ حَرَجٌ سخت تنگی کا نام ہے جس کے اندر کوئی جگہ نہیں اور گناہ کو بھی حَرَجٌ کہتے ہیں۔ (غ) ضِيْقٌ صدر عبارت ہے اس سے کہ اس میں بھلائی کے لیے کوئی رستہ نہیں۔ امام راغب کہتے ہیں اس سے مراد حزن ہے۔

﴿يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ سے مراد اوپر کو چڑھنا ہے جس سے دم رکنے لگتا ہے يَصَّعَّدُ اصل میں يَتَصَعَّدُ ہے اور صُعُوْدٌ اوپر کی طرف جانے کو کہتے ہیں۔

اس کا یہ منشا نہیں کہ خدا نے دو قسم کے انسان پیدا کیے ہیں اور بعض کا سینہ کھلا اور بعض کا تنگ پیدا کیا ہے۔ بلکہ یہ بتانا مراد ہے کہ امر حق کافر کو ایک پہاڑ کی طرح نظر آتا ہے حالانکہ فی الحقیقت وہی باتیں جن سے اس کے سینہ میں اتنی تنگی پیدا ہوتی ہے سینے کے کھولنے والی ہیں اور ان سے انسان کے اخلاق وسیع ہوتے ہیں۔ کافر کا سینہ بوجہ اپنے کفر کے تنگ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر تنگی کفر کا نتیجہ ہے کفر تنگی کا نتیجہ نہیں۔

قَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

میں سے ان کے دوست کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا اور ہم اس اپنی میعاد کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔ کہے گا آگ تمہارا ٹھکانا ہے اسی میں رہو گے۔ مگر جو اللہ چاہے بے شک تیرا رب حکمت والا علم والا ہے۔(1015)

1015- مَعْشَرَ کا اصل عَشْرٌ (دس) سے ہے اور چونکہ دس کو عدد کامل سمجھا گیا ہے اس لیے عَشِیْرَۃٌ ایک شخص کے اقارب کو کہا جاتا ہے جس سے وہ کثرت حاصل کرتا ہے۔ (غ) اور اس سے مَعْشَرٌ ہے جو اسی جماعت کو کہا جاتا ہے جن کا معاملہ ایک ہے [كُلُّ جَمَاعَةٍ اَمْرُهُمْ وَاحِدٌ] جیسے [مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ] ''مسلمانوں کی جماعت۔'' (ل)

الْجِنّ۔ جَنَّ کے معنی ڈھانک دینا ہیں۔ اور جِنّ وہ نوع ہے جس کو انسان کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی اور وہ اس سے پوشیدہ ہے۔ اسی نوع میں سے قرآن شریف نے ابلیس کو قرار دیا ہے ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ [الكهف: 50:18] ''وہ جنوں میں سے تھا'' اور شیطان بھی دو طرح کے بتائے ہیں ﴿شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ [الأنعام: 112:6] یعنی ایک انسانوں میں سے اور ایک جن میں سے۔ لیکن تبریزی نے شرح حماسہ میں لکھا ہے کہ عرب کے لوگ **ایسے شخص کو جو معاملات میں تیز اور زود رس ہو جن کہہ دیتے تھے**۔ چنانچہ اسی بنا پر [فَمَا نَفَرْتُ جِنِّيٌّ] میں جن سے مراد وہ رفیق لیے گئے ہیں جو جن کی طرح تھے۔ اور لسان العرب میں ایک شعر نقل کیا ہے جس میں شاعر اپنی معشوقہ کو جنی کے نام سے خطاب کرتا ہے۔ جہاں لسان العرب میں اس لفظ کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ وہ عورت جو جنیہ کی طرح ہو اپنے حسن و جمال میں یا اپنے تلون طبع میں۔ کیوں کہ انسان جنوں سے تعشق نہیں کرتا اور اشعار جاہلیت میں ہے [بِخَيْلٍ عَلَيْهَا جِنَّةٌ عَبْقَرِيَّةٌ] ایسے گھوڑوں پر کہ ان پر عبقری جن سوار تھے اور ایک میں ہے: [جِنٌّ اِذَا فَزِعُوْا، اِنْسٌ اِذَا اٰمَنُوْا] جہاں باوجود جن اور انس کے مقابلہ کے جن سے مراد انسان ہی ہیں (یہ دونوں مصرعے میں نے سرسید احمد خاں کی تفسیر سے نقل کیے ہیں۔) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ جن کو وسیع معنی میں استعمال کر لیتے تھے۔ یعنی خاص قسم کے آدمیوں کو بھی جن کہہ لیتے تھے۔

جن سے مراد خاص انسان ہونے پر دلائل:

اس جگہ آیا جن سے مراد وہی غیر مرئی ہستیاں ہیں یا مراد خاص قسم کے انسان ہیں؟ اس کا فیصلہ خود قرآن شریف کی عبارت کرتی ہے۔ اول تو فرمایا ﴿اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾ ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اب انسان تو ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر وہ غیر مرئی ہستیاں انسانوں سے اور انسان ان غیر مرئی ہستیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ پھر اس آیت میں تو جن و انس کو ایک دوسرے کے اولیاء کہا ہے اور اگلی آیت میں فرمایا کہ اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کے اولیاء

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع 15 8 2

اور اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں بہ سبب اس کے جو وہ کماتے ہیں۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہ آئے تھے جو تمہارے اوپر میری آیات کو بیان کرتے اور اس تمہارے دن کی ملاقات سے تم کو ڈراتے تھے؟ کہیں گے ہم اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیتے ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور وہ اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ (1015)

بنا دیتے ہیں۔ تیسرے اگلے رکوع کے شروع میں جنوں اور انسانوں کا ایک ہی معشر فرمایا جس کا اصل اطلاق ایک شخص کے اہل پر ہے۔ اگر الگ نوع والے جن یہاں مراد ہوتے تو انسانوں کے ساتھ انہیں ایک معشر قرار دے دیا جاتا۔ چوتھے میں فرمایا کہ جنوں اور انسانوں کے پاس انہی میں سے رسول آئے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ غیر مرئی ہستیاں ایک الگ نوع ہیں۔ ان کے پاس انسانوں میں سے رسول نہ آ سکتے تھے مگر جہاں تک قرآن کریم نے رسولوں کا ذکر کیا ہے وہ سب انسان رسول ہی ہیں اور بنی آدم کے ساتھ ہی وعدہ تھا کہ ﴿اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ﴾ [الأعراف: 35:7] ''اگر کبھی تمہارے پاس تمہی میں سے رسول آئیں میری آیات تم پر بیان کریں۔'' اور ان غیر مرئی ہستیوں کو بھی یہ رسول یا ان کے پیرو ہی مسلمان کرتے ہیں۔ جیسا حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا۔ پس یہاں جنوں سے مراد وہ انسان ہیں جو جنوں کی طرح ہیں۔ وہی لوگ جن کو شروع میں اکابر کہا ہے اور بڑے لوگ اس لیے جن کہلا سکتے ہیں کہ وہ عوام الناس کی نظروں سے عموماً چھپے رہتے ہیں۔ اور سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں ان قوی ہیکل لوگوں کو جن اور شیاطین کہا ہے جن کو قید کر کے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے عمارتیں بنوانے اور غوطہ زنی وغیرہ کے کام لیے اور اگر شیاطین کا لفظ آئمہ کفار اور ان کے سرداروں پر بولا جا سکتا ہے جیسا کہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے تو جن کا لفظ انہی لوگوں پر بولا جانا کوئی جائے تعجب نہیں۔

خلود جہنم سے استثناء:

حالانکہ یہاں بھی صاف کفار کا ذکر ہے مگر جہنم میں ان کے ساتھ رہنے کے ساتھ ایک استثناء بھی موجود ہے ﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس حالت سے انہیں باہر بھی نکال دے۔

1015۔ اس رکوع میں اصل ذکر بعض رسوم مشرکانہ کا ہے۔ مگر اس مضمون کو شروع کرنے سے پہلے پچھلے رکوع کے مضمون کی

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

یہ اس لیے کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کرنے والا نہیں، حالانکہ ان کے رہنے والے بے خبر ہوں۔ (1016)

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور سب کے لیے درجے ہیں اس کے مطابق جو انہوں نے عمل کیے اور تیرا رب اس سے بے خبر نہیں جو وہ کرتے ہیں۔

تکمیل کی ہے اور بتایا ہے کہ جس بات سے اب انکار ہے آخر اس کا اقرار کریں گے اپنی جانوں کے خلاف گواہی دینے سے مراد اپنے گناہ کا اقرار ہے۔

کیا جنوں میں سے رسول آئے؟:

اس آیت کے جنوں کو نوع انسانی کے جن نہ قرار دینے سے مفسرین کو یہ مشکل پیش آئی ہے کہ آیا جنوں میں علیحدہ جن رسول آئے۔ ظاہر ہے یہاں مِنْكُمْ سے مراد یہ نہیں ہوسکتی کہ جنوں میں سے جن اور انسانوں میں سے انسان رسول آئے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نوع کے لیے رسول بھیجتا ہے وہ اس نوع میں سے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان یہ کہتے ہیں کہ ملک یعنی فرشتہ ان کی طرف رسول کیوں نہ بھیجا گیا تو اس کا جواب یہ دیا کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ ان کی طرف رسول بھیجا جاتا ﴿قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾﴾ [بنی إسرائیل: 95:17] ''کہہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے۔'' یہ آیت اس بات پر قطعی شہادت دیتی ہے کہ ایک نوع دوسری نوع کی طرف رسول نہیں ہوسکتی اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ رسول صرف احکام پہنچانے والا نہیں بلکہ ان احکام پر عمل کر کے دکھانے والا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتہ انسان کے لیے نمونہ نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی انسان جنوں کے لیے نمونہ نہیں ہوسکتا اور جس طرح ملک انسانوں کے لیے رسول کا کام نہیں دے سکتا انسان جنوں کے لیے رسول کا کام نہیں دے سکتا۔ پس جنوں اور انسانوں کو ایک معشر قرار دے کر پھر ان میں سے رسول بھیجنے کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ ایک ہی نوع کا یہاں ذکر ہے اور اس دوسری نوع کا ذکر نہیں جو غیر مرئی ہستیاں ہیں۔

1016 - **ہلاکت سے پہلے تنبیہ ہوتی ہے:** یعنی رسولوں کے بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ بے خبری میں لوگ ہلاک نہ ہوں۔ ان کے فرائض سے ان کو آگاہ کرنے والا کوئی ہو۔ قرآن شریف میں جنوں کی کسی بستی کی ہلاکت کا ذکر نہیں۔ اگر جنوں کی طرف بھی انسان رسول مبعوث ہوئے ہوتے تو ان کی ہلاکت کا بھی کہیں ذکر ہوتا۔ بِظُلْمٍ کے معنی دو طرح پر ہوسکتے ہیں یعنی ایک یہ کہ ظلم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو یعنی اللہ ایسا نہ تھا کہ ظلم کر کے بغیر تنبیہ کیے اور رسول بھیجے ایک بستی کو ہلاک کر دے اور دوسرے یہ کہ محض لوگوں کے ظلم یعنی کفر یا شرک کی وجہ سے یا عقائد کی غلطی کی وجہ سے انہیں ہلاک نہیں کیا۔ جب تک پہلے رسول بھیج کر تنبیہ نہیں کر دی۔

وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔ اگر چاہے تم کو لے جائے اور تمہارے بعد جن کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے۔ جیسا تمہیں ایک اور قوم کی نسل سے پیدا کیا۔ (1017)

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ یقیناً آنے والا ہے اور تم اسے عاجز کرنے والے نہیں۔ (1018)

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

کہہ اے میری قوم تم اپنی طاقت کے مطابق عمل کرتے جاؤ میں بھی عمل کرنے والا ہوں۔ پھر تم کو معلوم ہو ہی جائے گا کہ کس کے لیے اس گھر کا (بہتر) انجام ہے؟ ہاں ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ (1019)

اور مطلب یہ ہے کہ گو بوجہ ظلم کے ان لوگوں کی حالت بہت خراب تھی کفر اور شرک کی انتہا کو پہنچ گئے تھے مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم اس قدر ہے کہ جب تک رسول بھیج کر ان پر اتمام حجت نہیں کر دیا اس وقت تک ان پر عذاب بھیجنا بھی پسند نہیں فرمایا۔ اسی کی طرف اشارہ [آیت نمبر: 133] کے الفاظ ذُو الرَّحْمَةِ میں ہے۔

1017 - اس میں صاف پیشگوئی ہے کہ اس کافر قوم کی جگہ دوسری قوم لے گی اور وہ مسلمان قوم تھی۔

1018 - بِمُعْجِزِيْنَ۔ عَجْزٌ انسان کے مؤخر یعنی پچھلے حصہ کو کہتے ہیں۔ اور اس لیے عجز کے معنی کسی شے سے پیچھے رہ جانا ہیں اور مراد اس سے لی جاتی ہے کہ کام کرنے میں کوتاہی کی جو قدرت کی ضد ہے۔ اور معجزین سے مراد ہے کہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے یعنی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ (غ)

1019 - مَكَانَةٌ۔ یہ ظرف ہونے کے لحاظ سے مکان یا حالت کے معنی میں بھی آتا ہے اور مصدر ہونے کے لحاظ سے اس کے معنی استطاعت بھی ہو سکتے ہیں۔

﴿عَاقِبَةُ الدَّارِ﴾۔ اَلدَّارِ سے مراد دار دنیا ہے اور عَاقِبَةُ سے مراد [اَلْعَاقِبَةُ الْحُسْنٰى] یا اچھا انجام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہی اعمال کا نتیجہ ظاہر ہو جائے گا۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور کھیتی اور چارپایوں سے جو اس نے پیدا کیے ہیں اللہ کے لیے حصہ ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں کے لیے ہے۔ سو جو ان کے شریکوں کے لیے ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو اللہ کے لیے ہوتا ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ (1020)

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کی اولاد کا قتل کرنا ان کے شریک اچھا کر دکھاتے ہیں تاکہ وہ انہیں ہلاک کر دیں اور ان کا دین ان پر خلط کر دیں۔ اور

نیکی کا نتیجہ اچھا اور بدی کا نتیجہ برا ہونے پر جس قدر یقین اور وثوق نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک میں تھا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف دشمنوں کی طرف سے تکلیف پر تکلیف پہنچتی ہے اور یہ زمانہ آپ ﷺ کی انتہائی بے کسی کا ہے۔ مگر کس قدر یقین حق کی آخری کامیابی پر ہے کہ ایک پہاڑ میں جنبش آ سکتی ہے مگر اس یقین کو جنبش دینے والی کوئی چیز نہیں۔

1020 - **آنحضرت ﷺ نے مشرکانہ رسوم کا استیصال کیا:** مشرکانہ رسوم اس قوم کے روزمرہ کے افعال کے اندر داخل ہو کر قومی خون کے اندر رچ گئی تھیں اور ان رسوم کا ان سے دور کرنا اور سینکڑوں سالوں کی عادات قومی کو بدل دینا کسی انسان کی طاقت میں نہ تھا۔ یہ کمال محمد رسول اللہ ﷺ کی قوت قدسی کو ہی دیا گیا کہ تمام رسوم کو چند سال کے عرصہ میں ایسا دور کیا کہ ان کا کہیں نام و نشان بھی نہ رہا۔ خیرات کے لیے جو حصہ الگ کرتے اس میں سے ایک حصہ اللہ کے نام پر رکھتے اور مہمانوں، مساکین وغیرہ پر خرچ کرتے اور ایک حصہ بتوں کے لیے جو کاہنوں اور بتوں کے مجاوروں کو دیتے۔ پھر طرح طرح کی تجویزوں سے اس حصہ کو جو خدا کے لیے ہوتا بتوں پر صرف کر دیتے۔ مثلاً اگر دیکھتے جو حصہ اللہ کے لیے مقرر کیا ہے وہ عمدہ حالت میں ہے تو اسے بھی بتوں کا چڑھاوا بنا دیتے یا کچھ خلط واقع ہو جاتا تو سارا بتوں کا چڑھاوا قرار دے دیتے۔ آج مسلمانوں کے چندے خیراتی کاموں کے لیے اسی رنگ میں رنگین ہیں۔ وعدہ کر لیتے ہیں مگر اپنی ضروریات آئیں تو جو حصہ خدا کے لیے دینا کیا ہے اسے بھی وہیں خرچ کر لیتے ہیں اور یوں کبھی نہیں ہوتا کہ اپنی ضروریات کو کاٹ کر اللہ تعالیٰ کے لیے دیں۔ الا ماشاء اللہ۔

مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اگر اللہ چاہتا تو ایسا نہ کرتے۔ سو ان کو اور جو وہ افترا کرتے ہیں چھوڑ دے۔ (1021)

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور کہتے ہیں یہ چارپائے اور کھیتی منع ہے۔ اس کو کوئی نہیں کھا سکتا، مگر وہ جس کو ہم چاہیں۔ ان کے خیال میں اور چارپائے جن کی پیٹھوں (پر چڑھنے) کو حرام کر دیا گیا ہے، اور چارپائے جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اس پر افترا کرتے ہوئے۔ وہ ان کو اس کا بدلہ دے گا جو وہ افترا کرتے تھے۔

1021 - يُرْدُوْا۔ رَدٰی کے معنی ہلاک ہیں ﴿وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى﴾ [اللیل:11:92] ''اور اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا جب وہ ہلاک ہوگا۔'' ﴿قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ﴾ [الصافات: 56:37] ''کہا اللہ کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دیتا۔''

قتل اولاد کی رسم:

قَتْلَ اَوْلَادٍ ایک تو بیٹیوں کا زندہ گاڑ دینا تھا۔ اس صورت میں ﴿شُرَكَآؤُهُمْ﴾ سے مراد ان کے اکابر ہوں گے جو ایک جھوٹی غیرت کی وجہ سے بیٹیوں کو زندہ نہ رہنے دیتے تھے۔ انہی کا تتبع عوام الناس کرنے لگے۔ اور علاوہ ازیں ان میں یہ بھی رسم تھی کہ جب بیٹوں کی تعداد دس تک پہنچ جائے تو ایک کو بتوں کا چڑھاوا چڑھا دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ عبدالمطلب نے کیا۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے والد کو بت پر چڑھاوے کے طور پر ذبح کرنے کے لیے چڑھایا اور آخر ایک سو اونٹ آپ کی جگہ دیا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [اَنَا ابْنُ الذَّبِيْحَيْنِ] (المستدرك للحاكم، جلد2، صفحہ،609حدیث:4048) میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔ یعنی ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے آپ کے والد عبداللہ۔

اولاد کو جاہل رکھنا بھی قتل کرنا ہے:

اور قتل اولاد سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی پرورش ظلم، شرک، جہالت میں کرتے جیسا کہ امام راغب نے ﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ﴾ [الأنعام: 151:6] ''اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔'' کی تفسیر میں لکھا ہے: [قِيْلَ اِنَّ ذٰلِكَ نَهْيٌ عَنْ شَغْلِ الْاَوْلَادِ بِمَا يَصُدُّهُمْ عَنِ الْعِلْمِ] ''کہتے ہیں اس سے مراد اپنی اولاد کو تعلیم نہ دلانا ہے۔''

لَبْسُ دین کو خلط کرنے سے مراد ہے کہ اصل دین توحید جو حضرت ابرہیم و اسماعیل علیہما السلام کا تھا اس پر نہ رہنے دیا۔

وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

اور کہتے ہیں جو کچھ ان چارپایوں کے پیٹوں میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے۔ اور اگر وہ (بچہ) مرا ہوا ہو تو وہ سب اس میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ ان کو ان کے بیان کا بدلہ دے گا' وہ حکمت والا علم والا ہے۔ (1022)

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ع 16 11 3

بے شک وہ گھاٹے میں ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو بیوقوفی سے لاعلمی میں قتل کر دیا اور جو اللہ نے ان کو رزق دیا تھا اس کو اللہ پر افترا کر کے حرام کر دیا۔ بے شک وہ گمراہ ہوئے اور وہ ہدایت پانے والے نہیں۔ (1023)

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ﴾ میں پھر پیشگوئی ہے کہ یہ رسوم بد سب ان کے درمیان سے دور کر دی جائیں گی۔

1022 - حِجر اصل میں حَجر سے لیا گیا ہے یعنی پتھر اور اس میں روکنے کے معنی آ گئے ہیں۔ جس طرح پتھر بوجہ اپنی صلابت کے روکتا ہے اور اس لیے حجر کے معنی ہیں تحریم کی وجہ سے ممنوع جیسے یہاں۔ اور حجر عقل کو بھی کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اس چیز سے روکتی ہے جس کی طرف انسان کا نفس اسے بلاتا ہے جیسے ﴿قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ﴾ [الفجر: 5:89] ''عقل والوں کے نزدیک قسم ہے۔''

وَصْفَ کسی چیز کا ذکر اس کے حلیہ اور اس کی نعت کے ساتھ کرنا۔ اور وصف حق بھی ہوتا ہے اور باطل بھی ﴿لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ﴾ [النحل:116:16] ''جو تمہاری زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں۔'' ﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴾ [الصافات: 180:37] ''تیرا رب (ہاں) عزت والا رب، اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔''

یہ تمام مشرکانہ رسوم عرب میں مروج تھیں مگر اسلام نے ایسا ان رسوم سے ملک کو پاک کیا کہ پھر ان میں سے کسی رسم کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ یوں اسلام نے صرف عقیدتاً توحید نہیں پھیلائی بلکہ ان کی عملی زندگی میں سے ہر ایک قسم کے شرک کو دور کیا۔

1023 - اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل اولاد سے مراد ان کی جہالت اور مشرکانہ رسوم میں پرورش کرنا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۪ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۙ﴿۱۴۱﴾

اور وہی ہے جس نے باغ پیدا کیے (ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے اور نہ چڑھائے ہوئے اور کھجوریں اور کھیتی، اس کے پھل مختلف قسم کے ہیں اور زیتون اور انار ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے۔ اس کے پھل سے کھاؤ جب وہ پھل لائے اور اس کے کاٹنے کے دن اس کا حق دو۔ اور بے جا خرچ نہ کرو، وہ بے جا خرچ کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ (1024)

وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۙ﴿۱۴۲﴾

اور چار پایوں میں سے جو اٹھائے جاتے ہیں اور جن پر سوار ہوتے ہیں اس سے کھاؤ جو تم کو اللہ نے رزق دیا ہے اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (1025)

1024 - مَعْرُوْشٰتٍ۔ عَرْشٌ چھتی ہوئی چیز کو کہتے ہیں اور [عَرْشَتِ الْكَرْمُ] کے معنی ہیں اس کے لیے چھت کے طور پر کوئی چیز بنا دی ﴿وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۙ﴾ [النحل: 68:16] ''اور درختوں میں اور اس میں جو وہ بناتے ہیں۔'' پس مَعْرُوْشٌ کے معنی ٹٹی پر چڑھایا ہوا۔ (غ) اور مَعْرُوْشٰتٍ سے مراد انگور وغیرہ ہیں جس کو کسی سہارے کی ضرورت ہوتی اور ﴿غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ﴾ وہ جو خود اپنے تنا پر کھڑے ہوتے ہیں۔ (ج)

اُكُلُهٗ۔ اُكُلٌ۔ کھانا اور اَكْلٌ یا اُكُلٌ وہ چیز ہے جو کھائی جائے مگر اُكُلٌ حظ یا رزق کے معنی میں بھی آتا ہے اور پھل کو بھی کہتے ہیں۔ (ل)

مُسْرِفِ۔ سَرَفَ کسی فعل میں حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے۔ خاص طور پر مال خرچ کرنے میں اور حد سے تجاوز دونوں طرح پر ہے۔ ضرورت سے زیادہ خرچ کرے یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر خرچ کرے خواہ قلیل ہی ہو۔ (غ) رسوم و رواج پر جو خرچ کیا جاتا ہے وہ سب طاعۃ اللہ سے باہر ہونے وجہ سے اسراف میں داخل ہے۔

اول نباتات میں جو اللہ تعالیٰ کی نعماء ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں حق صرف خالق کا ہو سکتا ہے اس کے سوا اور کسی کا حق نہیں۔ اور وہ حق زکوٰۃ ہے۔ مشرک نباتات یعنی کھیتیوں میں اور چار پایوں میں بتوں کے حقوق مقرر کرتے تھے۔ خود کھانے کا ذکر ترتیب طبعی کے لحاظ سے پہلے رکھا ہے۔

1025 - حَمُوْلَةً۔ حَمْلٌ سے ہے جس کے معنی اٹھانا ہیں۔ راغب رحمہ اللہ نے اس کے معنی کیے ہیں [مَا یُحْمَلُ] جو خود اٹھایا جائے یعنی

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

آٹھ نر اور مادہ، دو بھیڑوں میں سے اور دو بکریوں میں سے۔ کہہ کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے؟ مجھے علم کے ساتھ خبر دو اگر تم سچے ہو۔ (1026)

وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ

اور اونٹوں میں سے دو اور گایوں میں سے دو۔ کہہ کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ، یا وہ جو دونوں مادہ کے رحموں میں ہے؟ یا تم گواہ تھے جب اللہ نے تم کو یہ حکم دیا۔ پس اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ

چھوٹا۔

فَرْشٌ۔ فَرْشٌ کے معنی بچھانا ہیں اور زمین کو فَرَاشٌ کہا ہے کہ اس پر انسانوں کا استقرار ہے۔ فَرْشٌ کے معنی [مَا يُفْرَشُ] ہیں اور اس سے مراد [مَايُرْكَبُ] ہے۔ یعنی جس پر سواری کی جائے۔ (غ)

گزشتہ رکوع کی مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان جانوروں کا پیدا کرنے والا خدا تعالیٰ ہے نہ تمہارے بت۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے انہیں پیدا کیا ہے وہ کام ان سے لو۔ حَمُوْلَةً اور فَرْشً کے معنی میں بہت سا اختلاف ہے۔ میں نے امام راغب کے معنوں کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ اگلی آیات میں اس ترتیب سے ان جانوروں کا ذکر کیا۔ پہلے چھوٹے اور پھر بڑے۔

1026 - زَوْجٍ۔ نر اور مادہ میں سے ہر ایک دوسرے کا زَوْجٌ کہلاتا ہے۔ پس آٹھ اَزْوَاجٌ سے مراد ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ لے کر کل تعداد آٹھ ہے۔ جیسا کہ آگے خود تقسیم کر کے بتایا ہے۔

ضَاْنِ۔ ضَاْئِنٌ کی جمع ہے۔ بھیڑ، نر کَبَشٌ اور مادہ نَعْجَةٌ اور مَعْزٌ، مَاعِزٌ کی بکرا۔ نر تِيْسٌ ہے اور مادہ عِنْزٌ۔

بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ نر کو حرام کیا ہے نہ مادہ کو نہ ان کے بچوں کو۔ مشرک بعض وقت نر کو بتوں کا چڑھاوا قرار دے کر ان سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ بعض وقت مادہ کو۔ اور جیسا کہ پچھلے رکوع میں ذکر ہے بعض وقت جو بچہ پیٹ میں ہوا سے مردوں کے لیے حلال اور عورتوں کے لیے حرام قرار دیتے تھے۔ اس لیے نر اور مادہ کا ذکر الگ الگ کیا۔

بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع 17 4 4

باندھتا ہے تا کہ بے علمی سے لوگوں کو گمراہ کرے۔ اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔ (1027)

قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کہہ میں اس میں جو میری طرف وحی کی گئی ہے کسی چیز کو جو کوئی کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا۔ سوائے اس کے کہ مردار ہو یا خون گرایا گیا یا سور کا گوشت کیونکہ یہ (سب) ناپاک ہیں یا وہ نافرمانی ہو کہ اس پر اللہ کے سوائے دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔ پھر جو کوئی لاچار ہو جائے نہ خواہش کرنے والا، نہ حد سے بڑھنے والا۔ تو تیرا رب بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1028)

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ

اور ان پر جو یہودی ہیں ہم نے سب ناخن والے جانور حرام

1027 - اِبِلِ میں سے دو۔ جَمَلٌ یعنی نر اور نَاقَةٌ یعنی مادہ۔

بَقَرٌ میں سے دو۔ نر کو ثَوْرٌ کہتے ہیں مادہ کو بَقَرَةٌ جس کی جمع بَقَرٌ ہے۔

ان تمام رسوم کو مشرکین اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف منسوب کرتے تھے اور یہ سب ان کا افترا تھا۔

1028 - جب مشرکانہ رسوم کا ذکر ہوا جن کی رو سے حلال چیزوں کو حرام کیا جاتا تھا تو یہ بھی بتا دیا کہ وحی الٰہی کس چیز کو حرام ٹھہراتی ہے ﴿لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ﴾ بتاتا ہے کہ یہاں اشارہ سورہ نحل کی طرف ہے جو بلحاظ نزول سورہ انعام سے پہلے کی ہے اور سب سے پہلے اسی میں **غذاؤں کی حرمت وحلت** کا ذکر آیا ہے۔ یہاں زائد یہ بیان کر دیا کہ پہلی تین یعنی مردار اور خون جو بہہ گیا ہو اور سور کا گوشت یہ تینوں اپنی ناپاکی کی وجہ سے حرام کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ مضرات ہیں جو انسان کے جسم پر اور اس کے اخلاق پر برا اثر پیدا کرتے ہیں۔ اور ﴿اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کو ان تینوں سے الگ کر کے اسے فسق قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کی ناپاکی اصل نہیں بلکہ وہ محض خدا کے حکم کی نافرمانی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ غذاؤں تک میں مشرکانہ رسوم کی بیخ کنی کر دی جائے۔

ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

کیے تھے اور گائیوں اور بھیڑ بکری سے ہم نے ان کی چربی حرام کی تھی سوائے اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں پر لگی ہو یا جو ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو ان کی بغاوت کی وجہ سے سزا دی تھی اور یقیناً ہم سچے ہیں۔ (1029)

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں، تو کہہ، تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے اور اس کی سزا مجرم قوم سے نہیں ٹلتی۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾

جنہوں نے شرک کیا، اب وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے۔ اسی طرح وہ لوگ جھٹلاتے رہے جو ان سے پہلے تھے۔ یہاں تک کہ ہماری سزا کا مزا چکھا۔ کہہ، کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اس کو ہمارے لیے نکالو تم صرف ظن کی پیروی کرتے ہو اور تم نری اٹکلیں دوڑاتے ہو۔ (1030)

1029 - ﴿ذِیْ ظُفُرٍ﴾ ظُفُر انسان اور اس کے غیر دونوں پر بولا جاتا ہے اور ﴿ذِیْ ظُفُرٍ﴾ سے مراد [ذِیْ مُخَالِبْ] ہیں۔ (غ)
یعنی پنجہ والے، بہائم اور پرندوں میں سے وہ جن کی انگلیاں پھٹی ہوئی نہ ہوں جیسے اونٹ اور شتر مرغ اور بطخ۔ (ج)
حَوَایَا۔ حَوِیَّۃٌ کی جمع ہے انتڑیاں اور حَوٰی کے معنی ہیں جمع کیا اور اسے نگاہ رکھا۔ (ل)

حرمت بطور سزا:

مطلب یہ ہے کہ یہودیوں پر جو ان ممنوعہ غذاؤں یعنی سور وغیرہ سے علاوہ کچھ حرام کیا گیا تھا تو یہ ان کی شرارتوں کی وجہ سے ایک وقتی سزا تھی۔ یعنی ان کے مادۂ سرکشی کو کم کرنے کے لیے بعض چیزوں سے انہیں بطور سزا محروم کر دیا گیا۔

1030 - تَخْرُصُوْنَ۔ خَرَصَ پھل کے تخمینہ کرنے کو کہا جاتا ہے اور تَخْرُصُوْنَ کے معنی ہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔ اور ﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ﴾

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

کہہ دے تو اللہ کی دلیل ہی فیصلہ کن ہے سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا۔ (1031)

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا

کہہ اپنے وہ گواہ لاؤ جو یہ گواہی دیں کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے۔ پھر اگر یہ خود گواہی دیں تو تُو ان کے ساتھ گواہی نہ

[الذاریات:10:51] کے معنی ہیں کذابوں پر لعنت۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک قول جو صرف ظن اور تخمینہ کی بنا پر کہا جائے وہ خَرْصٌ ہے خواہ ایک چیز کے مطابق ہو یا مخالف کیونکہ اس کا کہنے والا وہ بات علم یا غلبہ ظن یا سماع کی بنا پر نہیں کہتا بلکہ صرف گمان اور تخمینہ کی بنا پر۔ اور اس طرح پر بات کہنے والا کاذب سمجھا جائے گا۔ (غ)

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا﴾ کی تفسیر:

جب ہر قسم کے دلائل ابطال شرک کے ہو چکے۔ تو اب ان کے آخری عذر کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا شرک بھی مشیت الٰہی سے ہے۔ اس کا جواب کئی طرح پر دیا ہے۔ اول یہ کہ یہ محض تکذیب ہے پہلے لوگ بھی اسی طرح کے بودے عذر بنا کر انبیاء کو جھٹلاتے رہے، آخر عذاب کا مزہ چکھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوتا کہ انسان شرک کریں تو پھر وہ شرک کی وجہ سے عذاب کیوں بھیجتا۔ دوسرا جواب اسی کے اندر ہے کہ پھر نبی کریم ﷺ کی کیوں تکذیب کرتے ہو۔ اگر تم ایسے ہی مسلوب الاختیار ہو تو پھر تکذیب کیوں کرتے ہو۔ حق کے قبول کرنے میں مسلوب الاختیار بنتے ہیں، اس کی تکذیب کے وقت نہیں بنتے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ کوئی علم پیش کرو۔ اگر الٰہی منشا یہ ہوتا کہ لوگ شرک کیا کریں تو اس کی تعلیم بذریعہ انبیاء بھی یہی ہوتی۔ مگر کسی نبی کی تعلیم شرک کی طرف نہیں بلاتی۔ اور آخر پر بتایا کہ یہ تمہاری باتیں نرے ظن اور اٹکلوں پر مبنی ہیں حالانکہ پیغمبر جو ابطال شرک کرتا ہے وہ یقینی علم کی بنیاد پر کرتا ہے۔

جو کچھ یہاں مشرکوں کی حالت بیان کی ہے آج وہی مسلمانوں کے کثیر حصہ پر صادق آ رہی ہے۔ ایک کثیر حصہ مسلمانوں کا ایسا ہے جو طرح طرح کے فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ خدا کے منشا کے خلاف تو ہم چل ہی نہیں سکتے۔ پس وہ چاہتا ہے تو ہم ایسا کرتے ہیں۔ اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بڑی جرأت سے کام لے کر بغیر صحیح علم کے اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں اور اس کو یہاں کذب قرار دیا ہے۔

1031 - اَلْبَالِغَةُ۔ بُلُوْغٌ کے معنی غایت مقصد کو پہنچ جانا۔ (غ) پس [حُجَّةٌ بَالِغَةٌ] وہ دلیل قطعی ہوئی جو مدعا کو ثابت کر دے۔

جو دلائل اوپر دیئے ہیں ان کو حجت بالغہ یا فیصلہ کن دلیل کے نام سے موسوم کیا ہے اور آخر پر فرمایا کہ ارادہ الٰہی تو ہدایت کے لیے ہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ وہ سامان بھی پیدا کر دے گا جو تم کو شرک سے نکال کر توحید پر قائم کر دیں۔ ﴿فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اگر اس کی مشیت انسانوں کو مجبور کرنا ہوتی تو وہ ہدایت پر مجبور کرتا۔

تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ هُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ع 18 6 5

دے اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کر جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان کی جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور وہ (دوسروں کو) اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ (1032)

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

کہہ آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے حرام کیا ہے۔ تم پر واجب ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کروں اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائی کی باتوں کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوئی ہوں اور اس جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے قتل نہ کرو مگر حق پر۔ اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ (1033)

1032 - هَلُمَّ کسی چیز کی طرف بلانے پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اصل بعض کے نزدیک هَالُمَّ ہے اور لُمَّ لَمَمْتُ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کی اصلاح کی اور بعض کے نزدیک هَلْ اَمَّ یعنی کیا تمہارے لیے اس میں اَمَّ یعنی قصد ہے۔ (غ)
مطلب یہ ہے کہ تم کوئی ایسا شخص پیش نہیں کر سکتے جس نے بر بنائے وحی الٰہی یہ کہا ہو کہ یہ مشرکانہ باتیں جائز ہیں۔

1033 - ﴿حَرَّمَ رَبُّكُمْ﴾ کے آگے آتا ہے کہ کسی کو شریک نہ کرو۔ مگر شرک کرنے کو حرام نہیں کیا بلکہ بلحاظ تاکید لَا بڑھا دیا ہے یا عَلَيْكُمْ سے اگلا بیان شروع ہوتا ہے یعنی تم پر واجب ہے کہ شرک نہ کرو۔ پس جو کرنے کی باتیں تھیں وہ بتا دیں ان کے خلاف حرام ہے۔
﴿مِنْ اِمْلَاقٍ﴾ مَلَقٌ مہربانی اور لطف یا نرمی اور مدارات کو کہا جاتا ہے اس سے تَمَلُّقٌ بمعنی چاپلوسی ہے اس لیے دعا اور تضرع کو بھی مَلَقٌ کہا جاتا ہے اور اِمْلَاقٌ فقیر ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اور اصل اس کا یہ ہے کہ سارا مال خرچ کر دیا۔ پس اس کے پاس کچھ نہ رہا۔ (ل) یہاں ﴿مِنْ اِمْلَاقٍ﴾ فرمایا یعنی مفلسی کی وجہ سے دوسری جگہ ہے ﴿خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ [بنی إسرائيل: 31:17] یعنی مفلسی کے ڈر سے، ہو سکتا ہے کہ دونوں کے ایک معنی ہوں، ہو سکتا ہے کہ پہلے سے مراد وہ ہیں جو مفلس ہیں اور دوسرے سے

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس طریق سے جو بہت اچھا ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ ہم کسی جی کو مکلف نہیں کرتے مگر اس کی وسعت کے مطابق اور جب تم بات کہو تو عدل کرو اگر چہ قریبی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو اس کا تم کو حکم دیتا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔ (1034)

وہ جو مفلس نہیں مگر مفلسی سے ڈرتے ہیں۔

توحید کا عملی رنگ:

ہر قسم کے شرک کی بلکہ اس کے ساتھ ہی مشرکانہ رسوم کی تردید کر کے اب اس رکوع میں بتایا ہے کہ توحید کو قبول کرنا محض ایک عقیدہ کا مان لینا نہیں بلکہ خاص اصول پر زندگی کو چلانے کا نام ہے۔ چنانچہ اول خلاصہ کے طور پر ہر قسم کے شرک کا ابطال یوں کیا کہ کسی چیز کو مسیح ہو یا ملائکہ ہوں یا بت ہوں یا اور چیزیں ہوں یا اہرمن ہو خدا کے ساتھ شریک مت ٹھہراؤ۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسرے احکام کا ذکر کیا جو انسان کی عملی زندگی کے لیے ہیں، گویا بتا دیا کہ شرک سے بچنا یہی ہے کہ صحیح اصول زندگی پر عمل پیرا ہو۔ ان میں سب سے پہلے والدین کے حقوق کی طرف توجہ دلائی پھر اولاد کے۔ قتل اولاد سے یہاں بعض نے مراد عزل وغیرہ سے بیج ضائع کرنا لیا ہے اور بعض نے لڑکیوں کا زندہ گاڑنا۔ مگر سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد جیسا کہ [نمبر: 1021] میں دکھایا جا چکا ہے یہی ہے کہ اولاد کو علم وغیرہ سے محروم مت کرو۔ کیونکہ اکثر لوگ محض اس خیال سے اولاد کو تعلیم نہیں دیتے کہ ہم مفلس ہیں یا مفلس ہو جائیں گے۔ مفلسی کے خوف سے لڑکیوں کو نہ مارتے تھے گویا والدین کے حقوق کے مقابل اولاد کے حقوق یہ بیان کیے کہ ان کو اچھی تعلیم و تربیت دی جائے۔ پھر ہر قسم کی بے حیائی کی باتوں سے روکا خواہ ان کا اثر دوسرے پر نہ پہنچتا ہو اور بدترین بے حیائی زنا ہے جس سے نسل انسانی کی افزائش پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ پھر بقائے نسل انسانی میں جو سب سے بڑی ضرورت ہے یعنی حفاظت جان اس کی طرف توجہ دلائی۔ ایک رنگ میں چاروں باتوں کا تعلق حفاظت جان سے ہے۔ ماں باپ کے ذریعہ سے جان پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت ہوتی ہے، پھر اولاد کے قتل سے روکا، پھر بے حیائی سے جس کی سب سے قبیح صورت زنا ہے جس سے اولاد ضائع ہوتی ہے۔ پھر دوسرے کو قتل کرنے سے روکا ہے۔ آخر پر عقل سے کام لینے کو کہا ہے کہ اس کے بغیر نوع انسان کا بقا نہیں رہ سکتا۔

1034 - اَشُدَّ۔ شِدَّةٌ کا استعمال مضبوطی عہد پر بھی ہے اور قوت بدنی پر بھی ﴿هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ [حٰمٓ السجدة: 15:41] ''طاقت میں ان سے زیادہ مضبوط ہے۔'' اور اَشُدَّ وہ حالت ہے جب انسان کے قوائے جسمانی مضبوط ہو جائیں اور قوائے اخلاقی کی

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

اور کہ یہ میرا راستہ سیدھا ہے سو اس کی پیروی کرو اور (دوسرے) راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تم کو اس کے راستہ سے ہٹا دیں گے اس کا تم کو حکم دیتا ہے تاکہ تم تقویٰ کرو۔ (1035)

ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ وَ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ ع 19 4 6

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اس پر (نعمت کا) اتمام کرنے کے لیے جو نیکی کرتا ہے اور ہر (ضروری) چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں۔ (1036)

مضبوطی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے ﴿حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً﴾ [الأحقاف: 15:46] ''یہاں تک کہ جب اپنی قوت کو پہنچتا ہے اور چالیس سال کو پہنچتا ہے۔'' (غ) اور یہاں مراد قوائے بدنی کی مضبوطی ہے۔

اس آیت میں حفاظت مال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سب سے پہلے **یتیم کے مال کی حفاظت کرنا**، پھر ناپ اور تول کو ٹھیک رکھنے کا حکم دیا، پھر حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں انصاف کا حکم دیا اور بالآخر اللہ کے عہد کی طرف توجہ دلا کر تمام احکام شریعت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا خاتمہ نصیحت پر کیا، کیونکہ لوگ مال کے معاملہ میں یا شہادت کے ادا کرنے میں خدا کو یاد نہیں رکھتے۔

1035 - حقوق اللہ یا اللہ کی توحید کے ساتھ حقوق العباد کو بیان کر کے اس سب کو صراط مستقیم کہا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ حقوق العباد کی ادائیگی بھی صراط مستقیم میں شامل ہے۔

1036 - ثُمَّ یہاں ترتیب کے لیے نہیں بلکہ مراد صرف ایک اور چیز کا ذکر ہے۔ [دیکھو نمبر: 44]۔

توریت کن معنوں میں اتمام نعمت ہے:

تَمَامًا یعنی اتمام نعمت کے لیے۔ اس قوم کے حالات کے مطابق توریت سے ہی ان پر اتمام نعمت ہوا۔ ہاں کل دنیا پر اتمام نعمت قرآن سے ہوا۔

﴿عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ﴾ اس سے مراد ہر ایک نیکی کرنے والا ہے۔ بعض نے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لیا ہے کہ انہوں نے تبلیغ میں احسان کیا یا مراد ہے [أَحْسَنَ الْقِيَامَ] یعنی کتاب کے قائم رکھنے میں نیکی کرے یا تَمَامًا سے مراد اس کے عمل احسان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نعمت کی زیادتی ہے۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور یہ کتاب جس کو ہم نے اتارا ہے برکت دی گئی ہے سو اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (1037)

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾

ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب صرف ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتاری گئی اور ہم ان کے پڑھنے سے یقیناً بے خبر تھے۔ (1038)

﴿تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ سے مراد صرف اسی قدر ہے کہ اس قوم کی ضرورت کے مطابق اس میں ہر شے کی تفصیل تھی جیسا کہ ایک ملکہ کے ذکر میں ہے ﴿وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [النمل: 23:27] ''اور اسے ہر چیز دی گئی تھی۔'' مراد صرف اس زمانہ کی ضروریات ہیں۔

چونکہ اگلے رکوع میں قرآن کریم اور محمد رسول اللہ ﷺ کے کمال کا ذکر ہے اس لیے اس کا خاتمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا ہے اور اس لیے بھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب قرآن کی صداقت پر گواہ ہے اور خود اس رکوع سے یہ تعلق ہے کہ جیسے احکام شریعت توحید کے ساتھ اب دیئے ہیں ایسے ہی احکام موسیٰ علیہ السلام کو بھی دیئے تھے۔

1037 - سورت کے خاتمہ پر اس رکوع میں دو باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ توحید کی تعلیم دنیا میں گو پہلے بھی آتی رہی جیسا کہ ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے ذکر میں فرمایا تھا اور اپنے اپنے وقت میں ہر قوم پر اتمام نعمت وہی تعلیم تھی لیکن وہ کامل تعلیم جو دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے بھیجی جاتی ہے وہ اس کتاب میں ہے جو مبارک ہے، جس کی خیر دائمی ہے اور کبھی منقطع نہ ہوگی [دیکھو نمبر: 982] اور دوسرا اس **توحید کا عملی نمونہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو پیش کیا ہے** اور یوں بتایا ہے کہ توحید کی تعلیم علمی رنگ میں اپنے کمال میں اگر قرآن شریف میں موجود ہے تو عملی رنگ میں وہ محمد رسول اللہ ﷺ میں ہے۔

1038 - یہاں مخاطب خصوصیت سے اہل عرب ہیں۔ اور ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا﴾ کا تعلق اَنْزَلْنٰهُ سے ہے یعنی اگر ہم کتاب نہ اتارتے تو تم ایسا کہہ سکتے تھے۔ اور صرف دو گروہوں کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ دو گروہ ملک عرب میں آباد تھے اور انہوں نے عرب کی اصلاح کے لیے کوشش بھی کی تھی۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے یہودیوں اور پھر عیسائیوں نے اپنا پورا زور اہل عرب کو یہودی اور عیسائی بنانے پر لگایا لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور ان کی دراست سے بے خبر ہونا اس لحاظ سے کہا کہ یہ کتابیں زبان عربی میں نہ تھیں اور ان کے ترجمے بھی وہ دوسری زبانوں میں کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی خیال تھا کہ ان کی مقدس کتابوں کو صرف مذہبی آدمی ہی پڑھ سکتے ہیں۔ یہودیوں کا تو اب تک یہی خیال ہے اور عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ کے پیدا ہونے کے بعد ترجمے شروع ہوئے۔

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

یا کہو اگر کتاب ہم پر اتاری جاتی تو ہم یقیناً ان سے زیادہ ہدایت پر ہوتے، سو ضرور تمہارے پاس تمہارے رب سے کھلی دلیل اور ہدایت اور رحمت آ گئی۔ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے اور ان سے پھر جائے؟ ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیات سے پھرتے ہیں برے عذاب کی سزا دیں گے اس لیے کہ وہ پھر جاتے تھے۔ (1039)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

وہ کسی بات کا انتظار نہیں کرتے مگر یہ کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کے بعض نشان آئیں۔ جس دن تیرے رب کے بعض نشان آئیں گے کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا، یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی۔ کہہ انتظار کرو ہم (بھی) انتظار کرنے والے ہیں۔ (1040)

1039 - اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ لوگ جن پر اب ہم نے یہ کتاب اتاری ہے یہود اور نصاریٰ سے بڑھ کر اتباع کریں گے اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے توریت اور انجیل کی پیروی میں کمزوری دکھائی ایسی کمزوری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے وقوع میں نہ آئے گی۔ آخر میں تکذیب کرنے والوں کو ڈرایا ہے۔

1040 - اشراط ساعۃ۔ اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں ایک حدیث مروی ہے جو الفاظ مختلفہ میں اور کئی طریقوں میں آئی ہے۔ اس میں کہیں تو یہ لفظ ہیں: [لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَّغْرِبِهَا، فَإِذَا طَلَعَتْ وَرَاٰهَا النَّاسُ، اٰمَنَ مَنْ عَلَيْهَا، فَذٰلِكَ حِيْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا): 4635) ''قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ کرے۔ پس جب لوگ اسے دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا کہ جب کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا۔'' اور کسی میں یہ لفظ ہیں کہ تین باتیں ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گی تو کسی شخص کو اس کا

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور (کئی) فرقے ہو گئے تیرا ان سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کی طرف ہے پھر وہ ان کو بتا دے گا جو وہ کرتے تھے۔ (1041)

ایمان نفع نہیں دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا تھا۔ اپنے ایمان میں خیر نہیں کمائی تھی۔ سورج کا مغرب سے طلوع کرنا اور دجال اور دابۃ الارض۔ اور کسی میں یہ لفظ ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی جب تک دس نشان نہ دیکھ لو۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع اور دخان اور دابۃ اور خروج یاجوج و ماجوج اور ظہور عیسیٰ بن مریم اور ظہور دجال اور تین خسف، ایک خسف مشرق میں اور ایک مغرب میں اور ایک جزیرۃ العرب میں اور آگ جو قعر عدن سے نکلے گی۔ اب پہلی بات یہ ہے کہ ان احادیث کو اس آیت سے کچھ تعلق نہیں سوائے اس کے کہ ان میں بھی یہ لفظ آئے ہیں کہ اس وقت کسی شخص کو ایمان نفع نہ دے گا اور آیت میں بھی یہ لفظ آتے ہیں مگر صرف اس بنا پر ان اشراط الساعۃ کو ﴿بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ﴾ کی تفسیر نہیں کہا جا سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں فرشتوں اور رب کے آنے کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بعض آیات رب کے آنے کا ذکر ہے اور ان احادیث میں ایسا کوئی ذکر نہیں بلکہ یہ کوئی اور نشانات ہیں۔ فرشتوں اور رب کے آنے سے کیا مراد ہے یہ [نمبر: 269] میں دکھایا جا چکا ہے اور دوسری دقت یہ ہے کہ ان احادیث میں ان اشراط میں صاف طور پر دجال یا مسیح موعود کے آنے کا ذکر ہے اور یہ احادیث سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ دجال کو مسیح موعود ہلاک کرے گا اور غیر مسلم مسیح موعود کی وجہ سے ایمان لائیں گے۔ اگر ان کا ایمان لانا بے سود تھا تو مسیح کو بھیجنے کا فائدہ کیا تھا؟ پس ضرور ہے کہ ان احادیث کا مطلب کچھ اور ہو اور بعض باتیں ان میں استعارہ کے رنگ کی ہوں، مگر اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ یہاں ہم نے صرف یہ دیکھنا ہے کہ ﴿بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ﴾ سے مراد کیا ہے؟ سو اس تفسیر کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ملائکہ او راللہ کے آنے کی [نمبر: 269] میں کی جا چکی ہے یعنی یہ کہ فرشتوں کے آنے سے مراد جنگوں میں عذاب کا آنا ہے اور رب کے آنے سے مراد دشمن کا استیصال قطعی ہے۔ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ﴿بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ﴾ کے آنے سے مراد موت کا آنا ہے۔ جو وہ بھی [مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ] کے ماتحت قیامت ہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب موت کے آثار ظاہر ہو جائیں تو پھر کافر کو ایمان لانا کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ نہ ایسے شخص کو ایمان کچھ فائدہ دے سکتا ہے جو منہ سے ایمان لایا مگر اعمال اس کے مطابق نہ کیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان بغیر اعمال کے کام نہیں دیتا۔ پہلی آیت میں جس عذاب کا ذکر تھا اس کی یہاں زیادہ صراحت کر دی ہے اور یہ سب تکذیب کرنے والوں کے لیے ہے اور یہی اشارہ ﴿فَانْتَظِرُوْۤا﴾ میں ہے۔

1041- شِيَعًا۔ شِيَاعٌ کے معنی انتشار اور تقویت ہیں اسی سے خبر کا شائع ہونا ہے اور شِيْعَةٌ وہ ہیں جن سے انسان قوت پکڑتا ہے اور جس سے وہ پھیلتے ہیں۔ (غ) اور ہر ایک قوم جو ایک امر پر جمع ہو وہ ایک شِيْعَةٌ ہیں اور ازہری کہتے ہیں وہ بعض بعض کی اتباع کرتے ہیں اور وہ سب متفق نہیں ہوتے اور یہاں مراد ایسے ہی فرقے ہیں جو ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ (ل)

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

جو کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے لیے دس اس کی مثل ہیں اور جو کوئی بدی کرتا ہے تو اس کی مثل ہی اس کو سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ (1042)

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

کہہ بے شک مجھ کو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے۔ دین صحیح ابراہیم راست رو کے مذہب (کی طرف) اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۶۲﴾

کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔ (1043)

اس سے مراد عموماً یہود و نصاریٰ لیے گئے ہیں مگر ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اس سے مراد اس امت کے اہل بدعت ہیں اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اوپر ایمان میں نیکی نہ کمانے والوں کا ذکر تھا اس لیے ساتھ ہی ایسے لوگوں کا بھی ذکر کر دیا۔

1042 - **نیکی اور بدی کی جزا و سزا کا جو قانون** یہاں بیان کیا ہے وہ دوسرے مقامات کے خلاف نہیں، ہر نیکی کا بدلہ ملتا ہے اور وہ دس گنا ہے یا اس سے بھی زیادہ، ہر بدی کا بدلہ ملتا ہے اور وہ اس بدی کی مثل ہوتا ہے یا اس سے بھی کم۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے بالکل معاف ہی کر دے۔

1043 - **آنحضرت ﷺ کے اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ہونے کی دلیل:** اس آیت میں عملی رنگ میں کمال توحید کو بیان کیا ہے۔ موحد انسان اپنے کمال کو اسی وقت پہنچتا ہے جب اس کا ہر فعل خیر عبادت کے رنگ میں ہو یا قربانی کے رنگ میں۔ جب اس کا جینا مرنا اپنے لیے نہ ہو بلکہ صرف اپنے مولا کے لیے ہو۔ رب العالمین کے لیے ہونے میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ عالمین کی ربوبیت میں لگ جاتا ہے اسی طرح موحد کامل بھی عالمین کی ربوبیت میں لگ جاتا ہے۔ پس توحید کا عملی رنگ مخلوق خدا کی ربوبیت ہے اور سب سے بڑی ربوبیت افضل المخلوقات انسان کی ربوبیت روحانی ہے جو انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی جاتی ہے اور اس ربوبیت روحانی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو حاصل ہوا۔ کیونکہ جس قدر اصلاح نسل انسانی کی آپ ﷺ نے کی وہ کسی نبی کے حصہ میں نہیں آئی۔ اس لیے آپ اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کل مخلوقات میں سے ٹھہرے۔

چونکہ اس سورت میں اصل بحث توحید الٰہی پر تھی اس لیے اس کا خاتمہ اس پر کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ توحید کے کس مقام کامل پر ہیں اور کہ توحید کا کمال عملی رنگ میں مخلوق خدا کی بھلائی میں لگ جانا ہے۔

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

کہہ کیا میں اللہ کے سوائے کوئی رب چاہوں اور وہ ہر چیز کا رب ہے اور کوئی جی (بدی) نہیں کماتا مگر (اس کا وبال) اسی پر ہے۔ اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا' پھر تمہارے رب کی طرف تمہارا لوٹ کر آنا ہے پھر وہ تم کو اس کی خبر دے گا' جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔ (1044)

ہر مسلم کا نصب العین:

اسی طرح اگر غور کیا جائے تو جس قدر انسان کا فعل اغراض نفسانی سے دور ہوتا ہے اسی قدر اس کا پایہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ ایک انسان اپنی ذات کے لیے کچھ کرتا ہے دوسرا اپنے عیال کے لیے، تیسرا اپنی قوم کے لیے، چوتھا اپنے ملک کے لیے، یہ سب تدریجاً ترقی ہے۔ لیکن سب سے بلند پایہ اس انسان کا ہے جو مخلوق خدا کے لیے کچھ کرتا ہے۔ اس اور اس سے اگلی آیت میں صرف آنحضرت ﷺ کو ہی توحید کامل کے عملی نمونہ کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ یوں پیش کرنے میں اصل غرض یہ ہے کہ ہر مسلمان کا نصب العین یہی ہو کہ اپنے آپ کو اس مقام عالی پر پہنچائے۔ یہی وجہ ہے نماز میں قبل از فاتحہ جو دعا سکھائی گئی اس میں یہی لفظ آتے ہیں ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾﴾ جہاں صرف لفظ اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کی جگہ جو آنحضرت ﷺ کے لیے خاص ہے عام مسلمانوں کو مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ کہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس دعا کے سکھانے میں غرض یہی ہے کہ ہر مسلمان توحید کامل کے اس عملی مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

1044 - وَازِرَةٌ - وَزَرٌ پہاڑ میں جائے پناہ کو کہا جاتا ہے ﴿كَلَّا لَا وَزَرَ﴾ [القيامة: 11:75] ''ہرگز نہیں کوئی جائے پناہ نہیں۔'' اور وِزْرٌ کے اصل معنی بوجھ ہیں۔ (غ) اور امام راغب نے ﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ [النحل: 25:16] ''کہ اپنے بوجھ قیامت کے دن پورے اٹھائیں۔'' کی تشریح میں لکھا ہے کہ یہ اس کی مثل ہے جو فرمایا ﴿وَ لَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ [العنكبوت: 13:29] ''اور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ (بھی)۔'' اور مطلب اس کا اس حدیث کے مطابق ہے [وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَمِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا] (سنن ابن ماجه: المقدمة، باب:36، حديث:208) یعنی وہ ایک برے رستہ پر ڈالنے کا بوجھ بھی اٹھائے گا۔

وَ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَکُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَ رَفَعَ بَعۡضَکُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیۡعُ الۡعِقَابِ ۫ۖ وَ اِنَّہٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۶۵﴾ ع 20/11/7

اور وہی ہے جس نے تم کو زمین کا حاکم بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا۔ تا کہ تم کو اس کے بارے میں آزمائے جو تم کو دیا ہے۔ تیرا رب جلدی بدی کی سزا دینے والا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1045)

یہ سنہرا قانون توحید کا ضروری تتمہ تھا۔ **ہر ایک انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے**۔ ایک کی ذمہ داری دوسرا نہیں لے سکتا۔ یہی اسلام کا اصل الاصول ہے اور **کفارہ کے عقیدہ** پر یہ ایسا سخت حربہ ہے جس کا جواب عیسائیوں کے پاس نہیں۔ ایک عجیب جواب البتہ انہوں نے تراشا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایک گنہگار دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا بے گناہ دوسرے کا گناہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ منطق تثلیث کی منطق سے کم نہیں۔ جو شخص دوسرے کا بوجھ یا گناہ اٹھائے گا وہی وَازِرَۃٌ بن جائے گا۔ یہ بھی عجیب بوجھ اٹھانا ہے کہ دوسرے کا بوجھ بھی لے لیا اور پھر بھی بوجھ کوئی نہیں۔ قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اس کے خلاف نہیں جو فرمایا کہ وہ یعنی سردار یا پیشوا دوسروں کے بوجھ بھی اٹھائیں گے جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے کیونکہ وہاں مراد یہ ہے کہ ایک طریق بد قائم کرنے کا بوجھ ان کے سر پر ہوگا مگر یہ نہیں کہ اس طریق بد پر جو لوگ چلے ہیں وہ اس وجہ سے اس بدی کے بوجھ سے بچ جائیں گے۔ بدی کرنے کا بوجھ وہ خود ہی اٹھائیں گے۔ بدراہ بتانے کا بوجھ بدی کرنے سے مزید شے ہے۔

1045 - **مسلمانوں کی حکومت کمال روحانی کا نتیجہ تھی:** سورت کا خاتمہ اس پر کیا کہ اللہ تعالیٰ تم کو زمین کا حاکم بناتا ہے۔ جب انسان عملی رنگ میں توحید کے کمال پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اس بات کا اہل ہو جاتا ہے کہ مخلوق خدا پر حکمران ہو۔ جس کے مدنظر سوائے دوسروں کی بہتری کے کچھ نہیں، اسی کو حکومت شایاں ہے۔ مگر وہ حکومت بھی آزمائش ہوتی ہے جب تک اس کی اہلیت رہتی ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ یہی حالت فی الواقع تاریخ اسلام میں نظر آتی ہے۔ گویا یہ آیت تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی مختصر مرقع ہے۔ مسلمانوں کو بادشاہت ان کی قوت اور ان کے سامان حرب کی وجہ سے نہیں ملی بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مخلوق خدا کے خیر خواہ تھے۔ جب وہ توحید کامل کے مقام پر کھڑے ہوئے اور سب قوموں سے یکساں سلوک کرنے والے ہوئے اور ان کی زندگیوں کی غرض انسان کی خدمت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے بادشاہ بنا دیا۔ یہ وہ بات ہے جس کا اعتراف خود عیسائیوں نے کیا ہے اور جب اس مقام عالی سے گر گئے اور خواہشات کے بندے بن گئے تو حکومت بھی ان سے لے لی گئی۔ پھر دوسری قوم کھڑی کر دی جاتی ہے۔ بدی کی سزا بھی ملتی ہے مگر غفر و رحم کی صفت سب پر فائق ہے۔

سورۃ الاعراف

نام:

اس سورت کا نام الْاَعْرَافِ ہے اور اس میں 24 رکوع اور 206 آیتیں ہیں۔ الْاَعْرَافِ کے معنی بلند مکان ہیں اور اس سورت کے پانچویں اور چھٹے رکوع میں کچھ لوگوں کا ذکر ہے جو اعراف پر ہوں گے اور یہ لوگ جیسا کہ [نمبر: 1086] میں دکھایا گیا ہے انبیاء علیہم السلام کا گروہ ہے اور چونکہ اس سورت میں ضرورت نبوت پر بحث ہے اس لیے اس کے نام میں انبیاء علیہم السلام کے مقام بلند کی طرف توجہ دلائی ہے۔

خلاصہ مضمون:

جس طرح پچھلی سورت میں توحید پر بحث تھی، اس سورت میں نبوت پر بحث ہے۔ اسی اصل مضمون کے مطابق:

① اس کی ابتدا اس بات سے کی ہے کہ نزول کتاب اللہ کی غرض کیا ہے؟ اور اس کا فائدہ کیا ہے؟ یہ پہلے رکوع کا مضمون ہے۔

② دوسرے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر کر کے ضرورت نبوت کو بتایا ہے۔

③ تیسرے میں بتایا ہے کہ وحی الٰہی ہی انسان کو شیطان کے حملوں سے محفوظ کر سکتی ہے۔

④ چوتھے میں وحی الٰہی کے رد کرنے والوں کا انجام بتایا ہے۔

⑤ اور پانچویں میں قبول کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اسی رکوع کے آخر پر۔

⑥ اور چھٹے رکوع کے شروع میں اعراف والوں کا ذکر ہے یعنی خود انبیاء علیہم السلام کے مقام بلند کا اور بقیہ رکوع ششم میں قبول کرنے والوں اور رد کرنے والوں کا مقابلہ ہے۔

⑦ ساتویں رکوع میں عالم جسمانی کی مثالیں دے کر حق کی تدریجی ترقی اور آخری کامیابی کی خوش خبری سنائی۔

⑧ آٹھویں میں حضرت نوح علیہ السلام کا،

⑨ نویں میں حضرت ہود علیہ السلام کا،

⑩ دسویں میں حضرت صالح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کا۔

⑪ گیارہویں میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر کر کے سمجھایا کہ کس طرح حق کی مخالفت کرنے والے آخر کار ناکام ہوتے رہے۔

⑫ اور بارھویں میں سزا کا عام قانون بیان فرما کر مخالفین قرآن کو تنبیہ کی۔

⑬ اور پھر تیرھویں رکوع سے لے کر اکیسویں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مفصل ذکر کیا۔ چنانچہ تیرھویں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا

ذکر کیا۔

⑭ چودھویں میں ساحروں کے آپ سے مقابلہ کا۔

⑮ پندرھویں میں بنی اسرائیل کی تکالیف کا ذکر کر کے ان کا علاج بتایا اور یوں مسلمانوں کو سمجھایا کہ ایسی ہی تکالیف ان پر آئیں تو وہ بھی یہی طریق اختیار کریں۔

⑯ سولہویں میں فرعونیوں پر دباؤ کے آنے اور بنی اسرائیل کی نجات کا ذکر کیا۔

⑰ سترھویں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شریعت ملنے کا۔

⑱ اٹھارہویں میں بچھڑے کی عبادت کا۔

⑲ انیسویں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی بے اعتدالیوں کا ذکر کرتے ہوئے اصل غرض کی طرف توجہ دلائی ہے۔جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اتنا لمبا ذکر کیا۔یعنی موسیٰ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پیشگوئی کرنا اور ان پیشگوئیوں کا توریت میں موجود ہونا۔

⑳ بیسویں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عامہ کے ذکر کے بعد پھر قوم موسیٰ علیہ السلام کی طرف رجوع کیا۔

㉑ اور اکیسویں میں یہود کی خلاف ورزی میثاق اور ان کی سزا کا ذکر کیا۔

㉒ بائیسویں رکوع میں میثاق شریعت سے میثاق فطرت کی طرف رجوع کیا۔کیونکہ میثاق شریعت میثاق فطرت کو ہی قوت دینے کے لیے آتی ہے اور ہر انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر گواہ ہے اور اسی کی طرف انبیاء علیہم السلام بلاتے ہیں۔

㉓ تئیسویں رکوع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے اعدا کے انجام کا ذکر کیا کہ کس طرح ان پر سزا تدریجاً اور آہستگی سے وارد کی جائے گی۔

㉔ چوبیسویں اور آخری رکوع میں بتایا کہ اس مخالفت میں خود مسلمانوں کو کیا راہ اختیار کرنی چاہیے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ یہ سورت کل کی کل نبوت پر ہے۔

تعلق

بلحاظ مضمون الْاَنْعَامُ اور الْاَعْرَاف کا تعلق ظاہر ہے۔الانعام کا مضمون توحید ہے اور الْاَعْرَاف کا نبوت اور توحید کے بعد نبوت کا ذکر لازم تھا۔مذہب کی یہی دو عظیم الشان بنیادیں ہیں اور یہ بھی ضروری تھا کہ توحید کے ذکر کے بعد نبوت کا ذکر آتا۔اس لیے الْاَنْعَامُ گو اس قدر لمبی نہیں مگر اسے الْاَعْرَاف سے پہلے رکھا گیا۔کیونکہ ترتیب مضمون کا تقاضا یہی تھا اور الْاَنْعَامُ کے آخری حصہ کو دیکھا جائے تو وہاں بھی نہایت صفائی سے توحید سے نبوت کی طرف مضمون کا رخ بدل دیا ہے۔جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توحید کے مقام بلند کو پیش کیا ہے ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴾ صرف یہ

کہہ دینا کہ خدا ایک ہے انسان کو فائدہ نہیں دے سکتا۔ جب تک کہ اس کی تمام حرکات وسکنات توحید باری کے رنگ میں رنگین نہ ہو جائیں اور یہ مقام بدوں نبوت حاصل نہیں ہوسکتا۔ نظارۂ قدرت سے جس توحید پر انسان پہنچ سکتا ہے وہ محض ایک خشک عقیدہ ہے۔ مگر نبوت جس توحید پر لا کر کھڑا کرتی ہے وہ ایک بار دار درخت ہے۔ یوں توحید سے نبوت کی طرف مضمون کا انتقال سورۃ الانعام کے آخر میں کر کے سورۃ اعراف کے مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔

زمانۂ نزول:

اس سورت اور سورۂ انعام کے نزول کا وقت قریباً ایک ہی ہے اور یہ دونوں سورتیں مکی زمانہ کے آخر کی ہیں جب مخالفت کمال کو پہنچ چکی تھی۔ خاص خاص آیات اس سورت کی جن کو ظن کی بنا پر مدنی کہا گیا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا تعلق سورت کے اصل مضمون سے اس قسم کا ہے کہ وہ علیحدہ زمانہ کی نہیں ہوسکتیں۔ عیسائی مورخین نے یہ کوشش کی ہے کہ [آیت نمبر: 157, 158] کو جن میں آنحضرت ﷺ کے متعلق پیشگوئیوں کا ذکر ہے جو توریت و انجیل میں ہیں مدنی قرار دیں کیونکہ ان میں توریت و انجیل کا نام آتا ہے مگر اس سے بڑھ کر بودی دلیل کوئی نہیں اور [آیت: 156] جس میں قوم موسیٰ کا ذکر ہے اس کا تعلق [آیت: 157] سے جس میں نبی اُمی کا ذکر ہے ایسا گہرا ہے کہ یہ دونوں آیتیں بلحاظ مضمون صاف طور پر ایک ہی وقت کی نظر آتی ہیں۔

اٰيَاتُهَا 206 (7) سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ (39) رُكُوْعَاتُهَا 24

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

الٓمّٓصٓ ۚ ①

میں اللہ بہت جاننے والا بہترین فیصلہ کرنے والا ہوں۔ (1046)

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ②

یہ کتاب ہے تیری طرف نازل کی گئی۔پس تیرے سینے میں اس کی وجہ سے کوئی تنگی نہ رہے کہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور مومنوں کے لیے نصیحت ہو۔ (1047)

1046 - الٓمّٓ کے ساتھ صٓ بڑھایا ہے جو صادق کے قائم مقام ہے جیسا کہ ضحاک سے روایت ہے۔(ر) یا اَفْصَلُ سے یعنی بہترین فیصلہ کرنے والا، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔(ج) نیز [دیکھو نمبر: 8]۔

1047 - ذِكْرٰى۔ ذِكْرٌ سے زیادہ بلیغ ہے اور اس کے معنی کثرت ذکر ہیں اور ذکر کسی شے کا قلب میں حاضر کرنا ہے۔(غ) قرآن شریف کا نام ذِكْرٌ یا ذِكْرٰى یا تَذْكِرَةٌ اس لحاظ سے ہے کہ وہ ان باتوں کو یاد دلاتا ہے جو فطرت انسانی میں ہیں، مگر غفلت کی وجہ سے دبی رہتی ہیں۔ وحی الٰہی ان کو یاد دلا کر انسان کو فطرت کے صحیح قوانین پر چلاتی ہے یا چونکہ ذکر کے معنی شرف ہیں۔ (ل) اس لیے قرآن کریم کا نام ذکر ہے کہ یہ انسان کو بلند مقام پر پہنچاتا ہے۔

﴿فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ﴾ جملہ معترضہ کے طور پر ہے اور اصل غرض نزول کتاب کی بتائی کہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور مومنوں کے لیے وہ نصیحت ہو اور یہ جو فرمایا کہ تیرے سینہ میں تنگی نہ ہو تو یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس کتاب کے نزول نے پیغمبر خدا کو شرح صدر عطا کر دی تھی۔ جیسا کہ فرمایا ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ [الانشراح: 1:94] ''کیا ہم نے تیرے لیے تیرا سینہ نہیں کھولا۔'' پس نزول کتاب کا فائدہ تو یہ بتایا کہ مصلح کے سینہ میں تنگی نہ رہے کیونکہ اصلاح میں جو جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ ایک آدمی کے گھبرا جانے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ لیکن جب ایک شخص کو خدا ایک کام پر کھڑا کرتا ہے تو اسے وسعت اخلاق، کامیابی پر ایمان اور دیگر ان صفات سے متصف فرماتا ہے جن کے بغیر اسے کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ سو اس جملہ معترضہ میں بھی ایک ضرورت نزول وحی کو ہی ظاہر کیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ان مشکلات کی طرف اشارہ ہو جو اس سورت کے نزول کے وقت آنحضرت ﷺ کو پیش آ رہی تھیں کہ آپ کی دس بارہ سال کی کوششوں کے باوجود مخالفت بڑھ رہی تھی۔ تو گویا یوں فرمایا کہ مشکلات تو بے شک بہت ہیں مگر چونکہ کتاب خدائے علیم وصادق الوعد کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس لیے ان

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب سے تمہاری طرف اتارا گیا۔ اور اس کو چھوڑ کر اور دوستوں کی پیروی نہ کرو بہت ہی کم تم نصیحت قبول کرتے ہو۔

وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝۴

اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں۔ سو ہمارا عذاب ان پر رات کو آیا یا دوپہر کو سوتے ہوئے۔ (1048)

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۵

سو ان کی پکار جب ہمارا عذاب ان پر آیا سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ انہوں نے کہا بے شک ہم ظالم تھے۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶

سو یقیناً ہم ان سے پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور یقیناً ہم رسولوں سے بھی پوچھیں گے۔ (1049)

مشکلات کے سبب کوئی گھبراہٹ تمہارے سینہ میں نہ آئے۔

نزول کتاب کی اصل غرض دو لفظوں میں بتائی ہے۔ بدی کے انجام بد سے ڈرانا اور بتا دینا کہ بدی کا انجام نیک کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور دوسرا مومنوں کے لیے ذِكْرٌ یا ذِكْرٰى یعنی ان کے لیے موجب شرف اور بلندی مرتبہ یا ان کو فطرت کے صحیح قوانین پر چلانا ہے، اس لیے یہاں بشارت کی بجائے ذِكْرٰى کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

چونکہ اس سورت میں اصل نبوت کی بحث ہے جیسا کہ پچھلی میں اصل توحید کی بحث تھی اس لیے اس کی ابتدا اس کلام سے نہایت موزوں ہے۔

1048 - بَيَاتًا۔ بَيْتٌ سے مصدر ہے اور اس کے اصل معنی [قَصَدُ الْعَدُوِّ لَيْلًا] ہیں یعنی رات کے وقت دشمن کا قصد کرنا۔ (غ)

قَآئِلُوْنَ۔ قَالَ يَقِيْلُ سے ہے۔ دوپہر کے وقت آرام کرنے کو کہتے ہیں۔ (غ)

1049 - کیا سوال ہوگا جن کی طرف رسول بھیجے گئے ان سے سوال ہوگا ﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ﴾ [الملك: 8:67] ''کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہ آیا تھا۔'' ﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾ [الأنعام: 130:6] ''کیا تمہارے پاس رسول نہ آئے تھے؟'' اور رسولوں سے سوال ہے ﴿مَاذَآ اَجَبْتُمْ﴾ [المآئدة: 109:5] ''تمہاری قبولیت کیسی ہوئی؟''

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝۷

پھر ہم ان پر علم کے ساتھ بیان کریں گے اور ہم کبھی غیر حاضر نہیں ہوتے۔

وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸

اور وزن اس دن حق ہے۔ سو جس کی نیکیاں بھاری ہوگئیں تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ (1050)

وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝۹

اور جس کی نیکیاں ہلکی ہوگئیں تو وہی ہیں جنہوں نے اپنا نقصان کیا، اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کے بارے میں ناانصافی کرتے تھے۔

1050 - اَلْوَزْنُ۔ اصل میں کسی شے کے اندازہ کے پہچاننے کو کہتے ہیں۔ راغب کہتے ہیں کہ عام طور پر وزن وہ سمجھا جاتا ہے جو ترازو کے ساتھ ہو (بلکہ حدیث میں بھی ترازو کا ذکر ہے) اور قرآن شریف میں ہے ﴿وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾ [الرحمن: 9:55] ''اور وزن کو انصاف سے قائم کرو۔'' اور ﴿وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ﴾ [بنی إسرائیل: 35:17] ''اور سیدھی ترازو سے تولو۔'' اور یہاں مراد تمام افعال واقوال انسانی میں عدل وانصاف کا ملحوظ رکھنا ہے اور ایسا ہی ﴿وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ﴾ [الحجر: 19:15] ''اور اس میں ہم نے ہر ایک چیز اندازہ کی ہوئی اُگائی۔'' جہاں مراد ہے کہ جو کچھ پیدا کیا اعتدال کی حالت میں پیدا کیا جیسا کہ فرمایا ﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ [القمر: 49:54] ''ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے پر پیدا کیا ہے۔'' اس سے وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ﴿وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِۨالْحَقُّ﴾ [الأعراف: 8:7] ''اور وزن اس دن حق ہے۔'' میں اشارہ محاسبہ میں عدل کی طرف ہے۔ (غ) اور مجاہد کا قول ہے کہ وزن سے مراد یہاں قضاء یعنی فیصلہ ہے۔ (ج)

وزنِ اعمال سے مراد:

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ میزان کا لفظ قرآن میں وسیع معنی میں آیا ہے۔ ایک جگہ رسولوں کے بھیجنے کے ذکر میں آتا ہے ﴿وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ﴾ [الحدید: 25:57] ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری جس سے مراد کسی صورت میں ترازو نہیں اور نہ کسی مفسر نے ایسا کہا ہے۔ ایسا ہی ﴿وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ﴾ [الرحمن: 7:55] ''اور آسمان کو بلند کیا اور میزان کو قائم کیا۔'' میں میزان کے رکھنے سے مراد کسی ترازو کا رکھنا نہیں بلکہ مراد عدل کا قائم کرنا ہے۔ جس پر سارے آسمانوں اور زمین کا بھی مدار ہے۔ اور حق یہ ہے کہ احادیث میں بھی جس ترازو کا ذکر ہے اس سے مراد بھی محض اس قسم کا ترازو لینا جس سے اجسام کو وزن کیا جاتا ہے صحیح نہیں۔ اس ترازو کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اس دنیا کی چیزوں پر اس کا قیاس نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اگر کہیں اعمال کے وزن کا ذکر ہے تو کہیں کتب اعمال کا اور کہیں صاحب اعمال کا اور ایک قوم کے اعمال

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰ ع 1 10 8

اور یقیناً ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا اور تمہارے لیے اس کے اندر روزی کے سامان رکھے۔ بہت کم تم شکر کرتے ہو۔ (1051)

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۫ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ

اور یقیناً ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں کو کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ سو

دنیوی کا ذکر کر کے جو قیامت میں کسی کام نہ آئیں گے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾[الکھف: 105:18] ''ان کے لیے ہم قیامت میں کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔'' یعنی قیامت کے دن ان کے دنیوی صنعتوں پر زور لگا دینے کو کوئی وزن نہیں دیا جائے گا۔

مَوَازِيْن۔ مَوْزُوْنٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور میزان کی بھی۔ پہلی صورت میں مراد اعمال موزونہ ہیں۔ یعنی نیکیاں اور میزان یا میزانوں کا بوجھل یا ہلکا ہونے سے بھی مراد یہی لی گئی ہے کہ نیکیوں کا پلہ بوجھل یا ہلکا ہوجائے جس میں علاوہ اس وقت کے کہ میزانیں بہت سی ہوئیں بہت کچھ محذوف ماننا پڑتا ہے۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ یہ مَوْزُوْنٌ کی جمع ہے اور مجاہد سے مَوَازِيْنٌ کے معنی حسنات یعنی نیکیاں ہی مروی ہیں۔

اعمال کا وزن یعنی ہر ایک عمل کا حساب میں آنا ایک ایسا امر ہے جس کی طرف صرف وحی الٰہی نے ہی ہدایت کی ہے۔ اس لیے قرآن کریم کے نزول کی اغراض کو بیان کرتے ہوئے وزن اعمال کا ذکر کیا ہے۔ انسان کا کمال اسی پر منحصر ہے کہ جو اعمال اس کی فطرت کو صحیح راہ پر چلانے والے ہیں ان کو کرے اور جن سے فطرت انسانی کو نقصان پہنچتا ہے ان سے بچے۔ اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ جن کے وہ اعمال جو وزن میں آتے ہیں ہلکے رہے انہوں نے اپنی فطرت کو خسارہ میں رکھا۔

1051 - مَعَايِشَ۔ مَعِيْشَةٌ کی جمع ہے یعنی عیش یا روزی کے سامان۔ لفظ عیش حیوان کی زندگی سے مخصوص ہے یعنی ایسی زندگی جس سے جسمانیت کا جزو غیر منفک ہے اور حَيٰوةٌ کا لفظ وسیع ہے اللہ تعالیٰ اور ملک پر بھی بولا جاتا ہے۔ (غ) قرآن شریف میں ﴿مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾[طٰہٰ: 124:20] ''تنگی کی زندگی۔'' میں اور ﴿عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾[القارعة: 7:101] ''خوشی کی زندگی۔'' میں روحانی زندگی پر بھی لفظ عیش بولا گیا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جب تمہارے جسم کے لیے ہم نے زمین کے اندر ہر قسم کے سامان پیدا کر رکھے ہیں تو جو حصہ تم میں حیوانیت سے بالاتر ہے یعنی ملکیت کا حصہ یا تمہاری روحانیت' کیا اس کے لیے کوئی سامان خدا تعالیٰ پیدا نہ کرتا؟ یوں اس آخری آیت میں ضرورت وحی کو بیان کرتے ہوئے اگلے رکوع کے ساتھ اس کا ربط کر دیا ہے۔

اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ⑪

انہوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے (نہ کی)۔ وہ فرمانبرداروں میں سے نہ ہوا۔[1052]

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ⑫

(اللہ نے) کہا تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھے حکم دیا؟[1053] اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔[1054]

1052 - اس رکوع میں ضرورت نبوت بتائی ہے اور آدم کا ذکر کیا ہے جو سورہ بقرہ میں مفصل گزر چکا ہے۔ مگر یہاں اس ذکر کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو بالکل نئے ہیں۔

آدم اور ابن آدم کا معاملہ ایک ہے:

سب سے پہلے یہاں یہ غور طلب ہے کہ اوپر کی آیت میں سارے انسانوں کو خطاب تھا اس عام خطاب کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تم سب کو پیدا کیا پھر تم سب کی صورت بنائی پھر فرشتوں کو آدم کی فرمانبرداری کے لیے کہا۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس رنگ میں ہر ایک ابن آدم آدم ہے۔ اور فرشتوں سے آدم کی فرمانبرداری کرانے میں ابنائے آدم کا بھی ذکر ہے۔ اور فی الحقیقت غور کیا جائے تو اگر وہ واقعات ہم کو پیش نہیں آتے جو آدم کو پیش آئے تھے تو اس قصہ کا قرآن میں رکھنے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟ غرض تو ہماری تعلیم ہے۔ پس آدم کے تذکرہ میں ہم کو سمجھایا ہے اور ابن آدم ہونے کی وجہ سے جو کچھ آدم کو پیش آیا وہی ابن آدم کو پیش آتا ہے۔ ہاں جس طرح ابن آدم شیطان کو جسمانی رنگ میں نہیں دیکھتا۔ بلکہ شیطان صرف وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اسی طرح آدم کی صورت میں سمجھنا چاہیے، باقی امور کے لیے [دیکھو نمبر: 52، 52(و 53]۔

1053 - بظاہر جہاں جہاں **سجدے کا حکم** آتا ہے ملائکہ کو آتا ہے۔ لیکن یہاں ﴿اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ سے معلوم ہوا کہ شیطان کو بھی حکم تھا۔ ملائکہ چونکہ اعلیٰ ہستیاں ہیں اس لیے ان کو حکم دینے میں جن یا شیاطین جو ادنیٰ ہستیاں ہیں وہ بھی شامل ہوگئیں۔

1054 - **جنوں کا آگ سے اور انسان کا مٹی سے پیدا ہونا:** سورہ بقرہ میں فرمایا تھا کہ ''اس نے انکار اور تکبر کیا۔'' یہاں اس کی تشریح کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو آدم سے افضل قرار دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ آدم کی پیدائش مٹی سے ہے اور میری پیدائش آگ سے ہے۔ دوسری جگہ عام طور پر جنات کے متعلق ہے ﴿وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝﴾ [الحجر: 27:15] جنوں کو ہم نے پہلے نار سموم سے پیدا کیا۔ یہ زمین بھی پہلے خود ایک شعلہ نار تھی اس لیے پہلی مخلوق کا اسی رنگ کا ہونا عین قرین قیاس ہے اور آگ سے ہونے کی وجہ سے ہی وہ غیر مرئی ہستیاں بھی ہیں یعنی ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس سے علاوہ آگ یا مٹی سے پیدا ہونا یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ وہی صفت ان میں غالب ہو جیسے انسان کے متعلق فرمایا ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

کہا پھر اس حالت سے اتر جا تیرے لیے یہ شایاں نہیں تو اس پر تکبر کرے سو نکل جا۔ تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے۔ (1055)

عَجَلٍ﴾ [الأنبیآء: 37:21] انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے یعنی اس میں جلد بازی ہے یا فرمایا ﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ﴾ [الروم: 54:30] ''تمہیں کمزوری (کی حالت) سے بنایا۔'' اب طین یا مٹی کی صفت نرمی ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں [مَرَرْتُ بِصَحِيْفَةٍ طِيْنٌ خَاتِمُهَا] جس کے معنی کیے ہیں [لِيْنٌ خَاتِمُهَا] یعنی طین سے مراد نرمی ہے۔ (ل) اور قرآن مجید میں دوسری جگہ دوسری ترکیب اختیار کی ہے۔ ﴿ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا﴾ [بنی إسرائیل: 61:17] ''کیا میں اس کی فرمانبرداری کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔'' [اَیْ خَلَقْتُهٗ فِيْ حَالِ طِيْنَتِهٖ.] (ل) اور آگ کی صفت تیزی ہے اور حدیث میں ہے [اتَّقُوا الْغَضَبَ فَإِنَّهَا جَمْرَةٌ تُوْقِدُ فِيْ قَلْبِ ابْنِ آدَمَ] (مصنف ابن ابی شیبة، کتاب19، باب6، حدیث:25893) ''غضب سے بچو وہ ایک انگارا ہے جو ابن آدم کے قلب میں جلایا جاتا ہے۔'' پس شیطان کہتا ہے کہ میں ناری صفت ہو کر کس طرح طینی صفت انسان کے سامنے جھک سکتا ہوں۔

1055 - الصّٰغِرِيْنَ۔ صِغَرٌ کی ضد کِبَرٌ ہے اور چھوٹا یا بڑا ہونا بلحاظ عمر بھی ہوتا ہے اور بلحاظ جسم بھی اور بلحاظ قدر و منزلت بھی اور صَاغِرٌ وہ ہے جو ذلیل مرتبہ پر راضی ہو جائے۔ (غ)

شیطان کے ہبوط سے مراد:

مِنْهَا میں ضمیر کس طرف جاتی ہے یعنی کس سے نکل جا؟ مفسرین میں سے کسی نے سَمَاء کہا ہے کسی نے زمرہ ملائکہ۔ مگر یہ دونوں باتیں نہ سند رکھتی ہیں نہ قیاس صحیح یہ چاہتا ہے۔ سَمَاءٌ کا تو اوپر ذکر نہیں اور نہ یہ ہبوط مکانی تھا۔ ملائکہ کا ذکر اوپر ہے مگر دور، اور شیطان ملائکہ میں سے نہ تھا۔ جس پر ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ [الکهف: 50:18] ''وہ جنوں میں سے تھا۔'' نص صریح ہے۔ قریب تر ذکر اس کا اپنی فضیلت کو پیش کرنا ہے اور اسی سے ہبوط کا حکم ہے اس نے کہا تھا ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس حالت سے نکل جا اور اگلے الفاظ خود اس معنی کے مؤید ہیں۔ کیونکہ فرمایا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ خیر ہونا اور تکبر ایک جگہ جمع ہو سکیں۔ بلکہ متکبر ذلیل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں بھی ہے [مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ... وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ] (شعب الإیمان للبیهقي، جلد10، صفحه455، حدیث: 7790) یعنی ''جو شخص اللہ کے لیے جھکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا رفع کرتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے اللہ اسے ذلیل کرتا ہے۔'' اصل سبق انسان کے لیے ہے کہ تکبر کا نتیجہ ذلت ہے جتنا انسان دوسروں سے اپنی بڑائی جتاتا ہے اسی قدر ان کی نظر میں ذلیل ہوتا ہے۔

قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ کہا مجھے اس دن تک مہلت دے جو وہ اٹھائے جائیں۔ (1056)

قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۱۵﴾ کہا تو ان میں سے ہے جن کو مہلت دی گئی۔ (1057)

1056 - ﴿یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴾ سے کیا مراد ہے؟ اگر قیامت کا دن مراد لیا جائے جو مُردوں کے جی اٹھنے کا وقت ہے تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ جب تک یہ عالم موجود ہے اس وقت تک انسان کے ساتھ خواہشات سفلی اور ان خواہشات کے ساتھ شیطان کا رہنا ضروری ہے مگر بعث کا لفظ وسیع معنی میں آتا ہے [وَالْبَعْثُ یَکُوْنُ بَعْثًا لِّلْقَوْمِ اِلٰی وَجْهِ مِّنَ الْوُجُوْهِ] (ل) [وَ تَاْوِیْلُ الْبَعْثِ اِزَالَةُ مَا کَانَ یَحْبِسُهُ مِنَ التَّصَرُّفِ](ل) یعنی جو چیز کسی امر میں تصرف سے روکتی ہو اس کا دور کر دینا بھی بعث ہے۔ پس ﴿یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴾ سے مراد ہر انسان کی بعثت روحانی کا وقت بھی ہوسکتا ہے یعنی وہ وقت جب شیطان پر انسان کو پورا تصرف حاصل ہوجاتا ہے۔

شیطان کے مہلت مانگنے سے مراد:

جیسا کہ [نمبر: 45] میں دکھایا گیا ہے یہ کوئی واقعی مکالمہ نہیں۔ شیطان جو رحمت الٰہی سے دور پڑا ہوا ہے اس کو مکالمہ سے کیا حصہ؟ صرف ایک حالت کا اظہار ہے اور چونکہ مسلم کی حدیث سے ثابت ہے کہ ہر انسان کے لیے ایک الگ الگ مَلک یعنی فرشتہ اور ایک شیطان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرا شیطان مسلمان ہوگیا۔ پس ﴿یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴾ میں اگر ایک طرف ذریت آدم کی طرف اشارہ ہے تو دوسری طرف ذریت ابلیس کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کیونکہ ہر انسان کو بدی کی تحریک کرنے والا وہی شیطان ہے جو اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ پس شیطان نے جو مہلت مانگی ہے وہ اپنی ذریت کے لیے مانگی ہے۔ جس طرح آدم کے ذکر میں ابن آدم شامل ہے۔ شیطان کے ذکر میں ذریت شیطان شامل ہے۔ اس آیت میں اور اس سے اگلی آیات میں سب کو شامل کر لینا حالانکہ آدم کا ذکر شروع تھا صاف بتاتا ہے کہ اصل میں ذکر آدم علیہ السلام میں بنی آدم کا ذکر ہی مقصود ہے۔

1057 - ﴿اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ﴾ ترکیب صاف بتاتی ہے کہ یہ تو پہلے سے ہی فیصلہ شدہ امر ہے۔ یہ نہیں کہ شیطان کی درخواست منظور ہوئی ہے۔ جب انسان کی اس زمینی زندگی کے لیے خواہشات سفلی کا اس میں رکھا جانا ضروری ہوا **تو ان خواہشات سفلی کے محرک شیطان کا وجود بھی ضروری ہوا۔** علاوہ ازیں بغیر مخالفت اور مقابلہ کے اور دشمن پر غالب آنے کے کوئی کامیابی کامیابی ہی نہیں کہلاسکتی۔ شیطان یا دشمن پر غالب آنے میں ہی انسان کی اصل کامیابی ہے۔ اگر مقابلہ کوئی نہ ہوتا تو انسان کے کمالات کا اظہار بھی نہ ہوسکتا۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۱۶﴾

کہا اس لیے کہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا میں ضرور تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا۔(1058)

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴿۱۷﴾

پھر میں ضرور ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے ان پر آؤں گا۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔(1059)

1058 - اَغْوَيْتَنِيْ۔ غَيٌّ سے ہے جس کے معنی میں امام راغب کہتے ہیں [اَلْغَيُّ جَهْلٌ مِّنْ اِعْتِقَادٍ فَاسِدٍ] یعنی غَيٌّ وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو۔ اسی لیے ﴿عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾[طٰہٰ: 121:20] ''آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی، پس ناکام ہوا'' میں غَوٰی کے معنی جَهِلَ کیے گئے ہیں۔ اور غویٰ کے معنی خَابَ یعنی ناکام رہا بھی کیے گئے ہیں اور [فَسَدَّ عَيْشُهٗ] بھی یعنی اس کی زندگی خراب ہوگئی۔ ﴿اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ﴾[ھود: 34:11] ''اگر اللہ کا ارادہ ہو چکا ہو کہ وہ تمہیں ہلاک کردے۔'' میں يُغْوِيَ کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں [يُعَاقِبُكُمْ عَلٰى غَيِّكُمْ] یعنی تمہاری غَيّ کی تمہیں سزا دے یا [يَحْكُمُ عَلَيْكُمْ بِغَيِّكُمْ] یعنی تمہاری غَيّ کا تم پر حکم لگائے۔ (غ) انہی دو معنوں میں سے کوئی سے معنی یہاں ہیں اور ابن جریر کہتے ہیں اَغْوَيْتَنِيْ، اَهْلَكْتَنِيْ یعنی مجھے ہلاک کیا اور یہ ظاہر ہے کہ اِغْوَاءٌ کے جو معنی بدی کی تحریک کرنا یا دوسرے کو بدراہ پر لگانا ہیں وہ یہاں قطعاً مراد نہیں کیونکہ سارے قرآن کریم میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نافرمانی کا حکم دیا تھا بلکہ حکم تو فرمانبرداری کا ہی دیا تھا۔

﴿لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ﴾ کسی چیز کے لیے قعود سے مراد اس کے لیے انتظار یا گھات میں بیٹھنا ہے۔ (غ)

1059 - **شیطان کے چاروں طرف سے آنے کے معنی** ہر طرح کی وسوسہ اندازی کرنا ہیں جیسا کہ آگے آدم کے ذکر میں ﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ سے ظاہر ہے اور جیسا کہ ﴿شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ﴾[الناس: 4:114] ''پیچھے ہٹ جانے والے کے وسوسہ کی شر۔'' سے ظاہر ہے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ چاروں کی طرف سے اس پر غلبہ پالے گا۔ شیطان کو انسان پر کوئی غلبہ نہیں دیا گیا۔ ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾[الحجر: 42:15] ''کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں۔'' اور الگ الگ چاروں کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ ﴿مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ﴾ سے مراد ان کی دنیا ہے۔ یعنی دنیوی لالچ دوں گا اور خَلْفِهِمْ سے مراد آخرت ہے یعنی وسوسہ اندازی کروں گا کہ اعمال کی جزا و سزا کچھ نہیں اور ﴿عَنْ اَيْمَانِهِمْ﴾ سے مراد ہے کہ ان کو نیکیوں سے روکوں گا اور شَمَآئِلِهِمْ سے مراد ہے کہ بدی کے لیے اکساؤں گا۔ (ج)

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

کہا اس (حالت) سے اتر جا ذلیل دھتکارا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری پیروی کرے گا یقیناً میں تم سب سے جہنم کو بھروں گا۔ (1060)

وَ يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

اور اے آدم! تو اور تیری بیوی باغ میں رہو۔ پھر جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے پاس نہ جاؤ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ

پھر شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے لیے ان کے وہ عیب کھول دے جو ڈھانکے گئے تھے۔ (1061)

1060 - مَذْءُوْمًا کے معنی مذموم ہیں یعنی عیب لگایا گیا۔ (غ) کیونکہ زام عیب کو کہتے ہیں۔

مَدْحُوْرًا۔ دَحْرٌ کے معنی نکال دینا اور دور کرنا ہیں ﴿وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا﴾ [الصافات: 37:8-9] ''اور ہر طرف سے ملامت کیے جاتے ہیں۔ دھتکارے ہوئے۔''

بدی اور اس کا مظہر شیطان واقعی مردود اور حقیر ہے۔ بدی کو اگر کرنے والے سے الگ کر دیا جائے تو خود وہ بھی اس کو اچھا نہ سمجھے گا۔ کوئی جھوٹ بولنے والا دوسرے کے جھوٹ کو اچھا نہیں کہتا۔ کوئی زنا کرنے والا دوسرے کے زنا کو اچھا نہیں سمجھتا۔ دنیا میں گو بدی کرنے والے رہیں مگر بدی ہمیشہ مردود اور ذلیل رہے گی۔ پس شیطان اور جس چیز کی طرف وہ بلاتا ہے فطرت انسانی دونوں کو دھکے دیتی ہے مگر پھر بھی انسان اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

1061 - وَسْوَسَ۔ وَسْوَاسٌ اصل میں اس ہلکی آواز کو کہتے ہیں جو ہوا سے پیدا ہوتی ہے۔ اور شکاری کے چلنے کی آہٹ کو بھی وسواس کہا جاتا ہے۔ (ل) اس لیے وَسْوَسَةٌ ناقص خیالات ہیں جو دل میں آئیں۔ (غ)

سَوْاٰتِ۔ سَوْاٰةٌ کی جمع ہے جس کے معنی شرمگاہ ہیں اور [خِلَّةٌ قَبِيْحَةٌ] (ت) یعنی بری خصلت بھی اور اس کی اصل سُوْءٌ یعنی برائی ہے۔ لیث نے اس آیت کے الفاظ میں سَوْاٰةٌ کے معنی کیے ہیں [كُلُّ عَمَلٍ وَّاَمْرٍ شَآئِنٍ] یعنی ہر ایک عمل یا امر جو عیب لگانے والا ہو۔ (ل) اور ابن اثیر نے اس کے ایک معنی کیے ہیں [كُلُّ اَمْرٍ يُسْتَحْيَا مِنْهُ] ہر ایک امر جس سے حیا آئے قول ہو یا فعل۔ (ن) اور بحر المحیط میں سَوْاٰةٌ کے معنی لکھے ہیں: [مَا يَسُوْءُهُمَا مِنَ الْمَعْصِيَةِ] یعنی نافرمانی جو ان

مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور اس نے کہا تمہارے رب نے تم کو اس درخت سے نہیں روکا مگر اس لیے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ (1062)

کے دکھ کا موجب ہو۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ **شیطان کا آدم کو پھسلانا وسوسہ کے ذریعہ سے تھا** جس طرح ہر انسان کو وہ پھسلاتا ہے۔ اور وسوسہ ڈالنے کی غرض بھی یہاں یہ بیان فرمائی ہے کہ ان کی سوأت جو ان سے چھپا کر رکھی گئی تھی یعنی ظاہر نہ ہوئی تھیں وہ ظاہر کر دے۔ آیا فی الحقیقت اس سے مراد کوئی لباس ہے جو ان کو پہنایا گیا تھا اور شیطان کی غرض اس لباس کو اتار دینا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ کوئی ظاہری لباس ہو تو کسی ممنوع درخت کے پھل کے کھانے سے اس کے رہنے یا اترنے کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ مفسرین نے بھی اس دقت کو محسوس کیا ہے۔ ابن جریر وہب بن منبہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ان پر ایک نور تھا جس کی وجہ سے ان کی سَوْاٰتِ دیکھی نہ جا سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ نور جن سَوْأَتِ کو ڈھانک سکتا ہے وہ ظاہری شرمگاہیں نہیں بلکہ باطنی عیوب اور قبائح ہیں اور سَوْاٰتِ کے یہ معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں اور اس آیت کے معنی کو [آیت: 27] حل کرتی ہے ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا﴾ ''اے آدم کے فرزندو! تمہیں شیطان دکھ میں نہ ڈالے۔ جس طرح تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا ان سے ان کا لباس اتروا دیا تا کہ ان کو ان کی سَوْاٰتِ دکھا دے۔'' جہاں مجاہد سے روایت ہے [هُوَ لِبَاسُ التَّقْوٰى] یعنی تقوی کا لباس تھا جو اتار دیا۔ پس سَوْاٰتِ سے مراد بھی عیوب اور قبائح ہی ہو سکتے ہیں اور حدیث میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جہاں مغیرہ بن شعبہ کے متعلق یہ لفظ ہیں: [هَلْ غَسَلْتُ سَوْاٰتِكَ اِلَّا اَمْسِ] جہاں سَوْاٰةٌ میں اشارہ اس بیوفائی کی طرف ہے جو مغیرہ سے ایام جاہلیت میں اپنے ساتھیوں سے وقوع میں آئی۔ (ن) اور روح المعانی میں ایک قول اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے [قِيْلَ هُوَ كِنَايَةٌ عَنْ اِزَالَةِ الْحُرْمَةِ وَ اِسْقَاطُ الْجَاهِ] یعنی اس سے مراد حرمت کا دور کرنا اور مرتبہ سے گرانا ہے۔ پس خود قرآن کریم اور حدیث اور مفسرین کی رائے سے یہ ظاہر ہے کہ سَوْاٰتِ سے مراد یہاں ان کے عیوب اور کمزوریاں ہیں اور شیطان کی غرض پھسلانے میں یہ تھی کہ وہ پردہ جو انسان کی کمزوریوں پر پڑا رہتا ہے دور ہو جائے یعنی اس سے کمزوری کا اظہار ہو۔

1062 - شیطان چونکہ جھوٹا تھا اس لیے واقعات کے عین خلاف ان کے دل میں وسوسہ ڈالا یعنی یہ کہ بدی سے تم کو اس لیے روکا گیا ہے کہ تم فرشتے نہ ہو جاؤ یا موت سے بچے رہو۔ گویا بدی کو اس قدر سجایا اور اس قدر اچھا دکھایا کہ انسان یہ خیال کرنے لگا کہ یہی میری موت سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ پہلا میلان انسان کا بدی کی طرف یہیں سے پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ارتکاب میں وہ کوئی لذت دیکھتا ہے یا اسے اپنی زندگی کے سامانوں کا موجب سمجھتا ہے۔ شیطان چونکہ دھوکہ باز ہے اس لیے بدی سے جو حالت پیدا ہوتی ہے عین اس کے الٹ ہونے کا وسوسہ ڈالتا ہے۔ بدی انسان کو ملکوتی صفات سے بہیمی صفات کی طرف لے جاتی ہے

وَ قَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۱﴾

اور ان سے قسم کھا کر کہا یقیناً میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ (1063)

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۲﴾

پس دھوکے سے ان کو گرا دیا۔ سو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا ان کے عیب ان پر کھل گئے اور وہ باغ کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے انہیں پکارا کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور تمہیں (نہیں) کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟ (1064)

اور زندگی سے موت کی طرف۔ اس لیے اس کا الٹ کہا کہ اس سے تم ملک بن جاؤ گے اور غیر فانی ہو جاؤ گے۔

1063 - قَاسَمَ۔ باب مفاعلہ یہ ظاہر کرنے لیے اختیار کیا ہے کہ اس نے یقین دلانے کے لیے قسم میں سخت زور لگایا۔

1064 - دَلّٰی۔ دَلْوٌ ڈول کو کہتے ہیں اور اِدْلَاءٌ توسل کو جس کے لیے [دیکھو نمبر: 238] اور تَدَلّٰی بلندی سے پستی کی طرف آنا ہے اور دَلّٰی کے معنی یہاں اِطْمَاعٌ یعنی طمع دنیا بھی کیے گئے ہیں۔ جیسے پیاسے کو پانی کنوئیں کی طرف لے جاتا ہے اور پھر اس میں پانی نہ ملے اور دوسرے معنی اَوْقَعَ یعنی گرا دیا کیے گئے ہیں۔ (ل)

یَخْصِفٰنِ۔ خَصْفٌ جوتی کے گانٹھنے یا اس کے بعض کو بعض پر چڑھانے پر بولا جاتا ہے اور حدیث میں ہے: [اِنَّهٗ كَانَ یَخْصِفُ نَعْلَهٗ] یعنی آنحضرت ﷺ اپنی جوتی خود گانٹھ لیتے تھے۔ (ل)

وَرَقِ۔ درخت کے پتوں کو کہتے ہیں وَرَقَةٌ واحد ہے ﴿مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ﴾ [الأنعام: 59:6] ''کوئی پتا نہیں گرتا'' اور وَرِقٌ درہم کو کہتے ہیں ﴿فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ﴾ [الكهف: 19:18] ''اب اپنے میں سے ایک کو اپنے اس روپے کے ساتھ بھیجو'' اور اَوْرَقَ فُلَانٌ جس کے لفظی معنی ہیں وہ شخص پتوں والا ہو گیا۔ اس سے مراد ہے وہ اپنی حاجت نہ پا سکا۔ گویا کہ وہ بغیر پھل کے پتوں والا ہو گیا اور ثَمَرٌ مال کو کہتے ہیں۔ (غ)

پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے سے مراد:

جب اوپر کی تشریح سے ثابت ہو گیا کہ جو لباس اترا تھا وہ لباس تقویٰ تھا اور جو سَوْاٰتِ ظاہر ہوئی تھیں وہ اندرونی کمزوریاں تھیں تو باغ کے پتے لگانے کا مفہوم بھی ظاہری نہیں ہو سکتا۔ بلکہ استعارۃً مراد اس سے ایسا فعل ہے کہ انسان اپنی کمزوری کا اخفا کرنے

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

انہوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اگر تو ہماری حفاظت نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾

کہا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور سامان ہے۔

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا

کہا اسی میں تم جیو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے

لگے اور ورق یا پتوں کا لفظ لا کر بتا دیا کہ یہ وہ انسانی کوشش ہے جو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتی جیسا کہ ورق والا ہو جانے سے مراد ہے حاجت کا نہ پانا گویا پھل اس سے نہیں ملتا صرف پتے ملتے ہیں اور پھل دینے والی وحی الٰہی ہے۔ معصیت کا ارتکاب پہلے پہلے انسان پر پشیمانی لاتا ہے وہی حالت آدم اور ان کی بی بی کی ہوئی۔ اور جب اپنی کمزوری کا احساس ہو گیا تو اب انسانی کوشش شروع کی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو بظاہر ایک جسمانی فعل معلوم ہوتا ہے اس کا اشارہ ایک روحانی امر کی طرف ہے۔ معصیت میں مبتلا ہونے سے لباس نہیں اترا کرتا ہاں احساس پیدا ہوتا ہے کہ انسان سے کمزوری سرزد ہوئی۔ اسی کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اگلے رکوع کی پہلی آیت میں لباس کا ذکر کیا ہے ﴿ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ جہاں ﴿ لِبَاسُ التَّقْوٰى ﴾ سے صاف بتا دیا کہ اسی لباس کا ذکر آدم کے متعلق ہے چنانچہ ﴿يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا﴾ میں مجاہد نے کہا ہے [هُوَ لِبَاسُ التَّقْوٰى] یعنی وہ لباس جو اتار دیا وہ لباس تقویٰ تھا۔ پس باغ کے پتے لگانے سے مراد بھی اپنی انسانی کوشش ہے۔ کیونکہ فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک دفعہ اگر بدی سے مغلوب بھی ہو جائے تو دوسری دفعہ پھر اٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر یہ انسانی کوشش کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقی علاج ﴿ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا﴾ میں بتایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ سے وہ علاج کرتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں۔ ایک کھانا' ایک لباس۔ کسی چیز کے کھا لینے سے کسی لباس کا اتر جانا صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ دونوں سے مراد روحانی امور نہ لیے جائیں۔ یعنی کھانے سے مراد کسی بدی کا ارتکاب تھا لباس کے اتر جانے سے مراد اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ یہی ہم دن رات بنی آدم میں دیکھتے ہیں۔ اس لیے آدم کے لیے کوئی الگ معنی تجویز کرنا انسانی تجربہ کو باطل کرنا ہے۔

ع 2 15 9 تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ تم نکالے جاؤ گے۔ (1065)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اے بنی آدم! بے شک ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہارے عیبوں کو ڈھانکے اور زینت ہو اور تقویٰ کا لباس، یہی بہتر ہے۔ یہ اللہ کی باتوں میں سے (باتیں) ہیں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔ (1066)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ

اے بنی آدم! شیطان تم کو دکھ میں نہ ڈال دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو باغ سے نکلوا دیا۔ ان سے ان کا لباس اتروا دیا تاکہ ان کو ان کے عیب دکھا دے۔ (1067)

1065 - ﴿فِيْهَا تَحْيَوْنَ﴾ میں بتایا کہ زمینی زندگی تمہارے لیے ضروری ہے یعنی اس سے تمہاری ترقیات پیدا ہوتی ہیں اور **زمینی زندگی کا اختتام موت سے ہوتا ہے**، نہ کسی اور طریق سے۔ اور اس موت کے بعد پھر اٹھنا ہے جس میں اس زمینی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے۔ یہ حصر اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ ان انسانوں کی زندگی جو اس زمین پر ہیں، اسی زمین پر محدود ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اٹھایا جانا اس آیت کے خلاف ہے۔ ایسا ہی زمینی زندگی کا انقطاع صرف موت سے ہوسکتا ہے۔ پس جس شخص کی زندگی اس زمین پر ختم ہوگی لازماً وہ موت کا مزہ چکھ کر ہوگی نہ کسی اور طرح۔

1066 - اَنْزَلْنَا اللہ تعالیٰ کا اپنی نعمتوں اور قسمتوں کا انزال یا نازل فرمانا صرف ان کا عطا کرنا ہے اور بعض وقت صرف ان کے حصول کے اسباب پیدا کر دینا اور ان اسباب کی طرف انسان کو ہدایت کر دینا ہی ہوتا ہے۔ (غ)

لِبَاسٌ۔ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو انسان کے کسی قبیح امر کو ڈھانک لے۔ (غ) اسی لیے بی بی کو خاوند کا اور خاوند کو بی بی کا لباس کہا ہے۔

رِيْشٌ۔ پرند کے پروں یا کلغی کو کہتے ہیں جو بمنزلہ انسان کے لباس کے ہے۔

پچھلے رکوع میں یہ بتایا تھا کہ انسان صرف اپنی کوشش سے وساوس شیطانی سے نہیں بچ سکتا۔ اس لیے وحی الٰہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی مضمون کو جاری رکھتے ہوئے تمام نسل انسانی کو خطاب کر کے بتایا ہے کہ وحی الٰہی کی پیروی سے تم شیطان سے بچ سکتے ہو۔

1067 - **لباس کے اتارنے سے یہاں کیا مراد ہے؟** اس میں شک نہیں کہ جس ﴿لِبَاسُ التَّقْوٰى﴾ کا یہاں ذکر ہے وہ ایمان اور اعمال صالحہ کا لباس ہے۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ سے مروی ہے۔ تو ایک معنی تو یوں ہوں گے کہ وہ ظاہری لباس جو تمہاری پردہ

يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

وہ اور اس کی جماعت تم کو ایسی طرح پر دیکھتے ہیں کہ تم ان کو نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ (1068)

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا کرتے پایا۔ اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ اللہ (کبھی) بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔

پوشی کرتا ہے۔ پھر صرف پردہ پوشی ہی نہیں بلکہ زینت کا کام بھی دیتا ہے۔ وہ تمہارے جسموں کی حفاظت اور زینت کے لیے بھی آخر خدا نے ہی بہم پہنچایا ہے۔ پس جس خدا نے تمہارے جسموں کے لیے یہ سامان بنایا کیا اس نے انسان کی روحانی کمزوری، اس کے اخلاقی عیوب پر پردہ پوشی اور اس کی روحانی زینت کے لیے ہی کوئی سامان نہیں بنایا؟ یوں لباس ظاہری سے لباس باطنی کی طرف توجہ دلائی۔ مگر یوں بھی اس کے معنی ہو سکتے ہیں کہ ﴿اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا﴾ سے مراد وحی الٰہی ہی ہو۔ جو انسان کے عیوب کو ڈھانکنے اور اس کی زینت کا موجب ہے۔ کیونکہ اگلی آیت میں صاف طور پر آدم کے لباس کے اتر جانے کا ذکر کر کے سب انسانوں کو متنبہ کیا ہے کہ جس طرح شیطان نے تمہارے باپ اور ماں کا لباس اتروا دیا تھا۔ اسی طرح تمہارا لباس نہ اتار دے۔ دیکھو اگلا نوٹ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جس لباس کا ذکر ہے وہ لباس روحانی ہے اور اسی لباس کو جو انسان کے عیوب روحانی کے دور کرنے اور اس کی زینت کا موجب ہے، ﴿لِبَاسُ التَّقْوٰى﴾ کہا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اس لباس کا پہن لینا یعنی وحی الٰہی پر عملدرآمد کرنا تمہاری بہتری کا موجب ہے اور انسان کی حقیقی زینت کا موجب یہی لباس روحانی ہے۔

1068 - قَبِيْلُ۔ قَبِيْلَةٌ کی جمع ہے اور اس جماعت کو کہتے ہیں جو اجتماع کا رنگ رکھتی ہو اور ان کے بعض بعض کی خاطر توجہ کرنے والے ہوں۔ (غ) ﴿وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ﴾ [الحجرات: 13:49] ''اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے۔''

یہاں لفظ کَمَآ کے استعمال سے صاف بتا دیا کہ جو حملہ شیطان کا آدم پر تھا وہی ابن آدم پر ہوتا ہے۔ جس طرح اس کو دکھ میں ڈالا کہ باغ سے نکال دیا، اسی طرح ہر ابن آدم کو دکھ میں ڈالنے کا وہ موجب ہو سکتا ہے۔ جس طرح شیطانی وسوسے سے ان میں ایک کمزوری نمودار ہو گئی، اسی طرح ہر انسان اس کمزوری کا شکار ہو سکتا ہے۔ یہی معنی امام مجاہد نے کیے ہیں یعنی ﴿يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا﴾ کی تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں ۔۔۔۔ [هُوَ لِبَاسُ التَّقْوٰى] یعنی اس لباس کے اتروا دینے سے مراد لباس تقویٰ کا اتروا دینا یا معصیت کرانا ہے۔ مزید تشریح کے لیے [دیکھو نمبر: 1061, 1064]۔

اس سے صاف شہادت ملتی ہے کہ آدم نے بھی شیطان کو نہیں دیکھا جس طرح ہم نہیں دیکھتے نہ کوئی انسان جنوں کو دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ (1069)

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۫ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ؕ

کہہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔ اور اپنے آپ کو ہر سجدے کے وقت میں سیدھا رکھو اور فرمانبرداری کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے اسے پکارو۔ جس طرح تم کو پہلے بنایا تم لوٹ کر (بھی) آؤ گے۔ (1070)

فَرِیْقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ

ایک گروہ کو ہدایت کی اور (دوسرا) گروہ اس پر گمراہی ثابت ہوگئی کیونکہ انہوں نے اللہ کے سوا شیطانوں کو دوست بنایا۔ اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ سیدھی راہ پر

شیطان بھی جنوں میں سے ہے۔ ہاں شیاطین الانس کو بے شک دیکھ سکتا ہے اور جنوں کو دیکھنے وغیرہ کے جو قصے بنے ہوئے ہیں سب بے بنیاد ہیں۔ ہاں کشفی نظر سے وہ دیکھے جا سکتے ہیں اور وہ انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کے سوا اور کوئی دخل ان کے کاروبار میں نہیں دیتے۔ جیسا کہ اکثر قصے بنے ہوئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ **شیطان کے لفظ کا استعمال** اسم جنس کے طور پر ہوا ہے۔ کیونکہ شیطان کا ذکر کرتے کرتے یہاں اس کی جماعتوں کا ذکر بھی کر دیا۔

1069 - عرب کے لوگ اپنے مشرکانہ رسوم و رواج کو جو ان کے باپ دادا سے چلے آتے تھے خدا کے حکم کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اصول کیا عمدہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ جو سرچشمہ قدوسیت ہے وہ ناپاکی اور بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے سکتا۔ پس جس بات کو فطرت انسانی بے حیائی میں داخل کرتی ہے وہ خدا کا حکم نہیں ہو سکتا۔

1070 - قِسْطِ کے معنی عدل کا حصہ ہیں۔ پس اس میں ہر قسم کی طاعات داخل ہیں کیونکہ جو دوسرے کا حق لیتا ہے یا اس کا حق دیتا نہیں وہ عدل نہیں کرتا۔ افراط و تفریط قِسْطٌ یعنی عدل کے خلاف ہیں۔

مَسْجِدٍ۔ سجدہ کا وقت یا سجدہ کا مکان۔ مراد اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے۔

جب فواحش سے روکا تو ساتھ ہی بتایا کہ اللہ تعالیٰ حکم کن باتوں کا دیتا ہے۔ حقوق انسانی کی ادائیگی تو قِسْطِ میں آ گئی۔ اصول عدل کو ملحوظ رکھو اور دوسرے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف توجہ دلائی۔

﴿كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ﴾ میں توجہ دلائی کہ تمہاری تیاری ایک اور زندگی کے لیے ہونی چاہیے۔ جس خدا نے پہلے بنایا وہی تم کو تمہارے اعمال کی جزا و سزا کے لیے پھر بنائے گا۔

مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ چلنے والے ہیں۔ (1071)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ ع 3 6 10

اے بنی آدم! ہر سجدے کے وقت اپنی زینت کو لے لیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور زیادتی نہ کرو۔ وہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ (1072)

1071 - ﴿فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ﴾ یہاں انہی لوگوں کے وصف میں ہے جن کے متعلق دوسری جگہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا اضلال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس لیے گمراہ ٹھہراتا ہے کہ گمراہی کا فتویٰ ان پر صادق آتا ہے یا گمراہی ان پر ثابت ہوتی ہے اور گمراہی کن لوگوں پر ثابت ہوتی ہے؟ جو شیطانوں کو دوست بنا کر ان کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور پھر طرفہ یہ کہ اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ جس نے بدی کو نیکی سمجھ لیا اس کا بدی سے نجات پانا محال تک پہنچ جاتا ہے۔

1072 - سجدہ یا فرمانبرداری کے وقت میں زینت لینے سے مراد اکثر مفسرین نے کپڑوں کا پہننا لیا ہے۔ اس لیے کہ عرب کے لوگ حج کے وقت یا دعا کے وقت کپڑے اتار دیا کرتے تھے یہاں تک کہ عورتیں بھی برہنہ ہو جایا کرتی تھیں۔ اس خیال سے کہ جن کپڑوں میں گناہ کیا ہے ان کپڑوں میں عبادت نہیں کرنی چاہیے۔

لیکن ہوسکتا ہے کہ زینت سے مراد روحانی زینت ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو تو ان سب سامانوں کو بھی ساتھ رکھو جو انسان کی حقیقی زینت کا موجب ہیں۔ گویا اخلاق حسنہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرو۔ چنانچہ اس رکوع کی سب سے پہلی آیت میں جب لباس کو پردہ پوشی اور زینت کا سامان قرار دیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ اس سے بہتر ایک لباس اور بھی ہے اور وہ لباس تقویٰ ہے یعنی نیکی سے آراستہ ہونا۔ پس اگر زِيْنَتَكُمْ سے لباس کا پہننا یا اچھے لباس میں ملبوس ہونا مراد ہے تو ساتھ ہی یہ بھی مراد ہے کہ حقیقی زینت روحانیت ہے اس کو بھی ساتھ رکھو اور اپنے آپ کو تقویٰ سے آراستہ کر کے مسجدوں میں جاؤ۔ اور جس طرح اخلاق حسنہ کی طرف توجہ دلائی ساتھ ہی کھانے پینے کے متعلق بھی ہدایت فرمائی جس کے چار پانچ لفظوں میں نصف طب آ جاتی ہے۔ کھاؤ اور پیو اور زیادتی نہ کرو۔ **یعنی کھانے پینے تک میں افراط وتفریط سے بچو۔** اس میں ہر قسم کی افراط وتفریط آ جاتی ہے۔ مثلاً خاص قسم کی چیزیں کھانا یا خاص قسم کی چیزیں ترک کر دینا سب اسراف میں داخل ہے۔

گوشت کھاتا ہے تو سبزی نہیں کھاتا، یا سبزی کھاتا ہے تو گوشت نہیں کھاتا۔ ایسا ہی جس مقدار غذا کی انسان کے لیے ضرورت ہے اس میں ضرورت سے زیادہ کھا لینا یا جس قدر ضرورت ہو اس سے کم کھانا یہ سب افراط وتفریط میں داخل ہیں اور کھانے پینے میں اصول اعتدال نہ صرف صحت جسمانی کو قائم رکھنے والی چیز ہے بلکہ اس سے انسان کی ساری خواہشات سفلی حالت اعتدال پر آ جاتی ہیں اور شیطان جو ان خواہشات سفلی کا محرک ہے وہ اس کا فرمانبردار ہو جاتا ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

کہہ کس نے اللہ کی زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے اور کھانے کی ستھری چیزوں کو حرام کیا ہے۔ کہہ وہ دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان لائے قیامت کے دن خالص (ان کے لیے) اسی طرح ہم باتوں کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ (1073)

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کہہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو چھپی ہوں اور گناہ کو اور ناحق بغاوت کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک کرو جس کے لیے اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور یہ کہ اللہ پر وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے۔ (1074)

1073 - **اچھی چیزوں کا استعمال خلاف شریعت نہیں:** اچھی چیزوں کو روحانی ہوں یا جسمانی اللہ تعالیٰ نے منع نہیں کیا، نہ اچھے کھانوں کو۔ نعمائے دنیا بھی اگر مومن کو میسر ہوں تو ان سے فائدہ اٹھائے۔ آنحضرت ﷺ حالانکہ نہایت درجہ کی سادگی سے گزارہ کرتے تھے۔ نہایت ہی سادہ غذا، نہایت ہی سادہ لباس، نہایت ہی سادہ مکان لیکن اگر کھانے کے لیے کوئی اچھی چیز آ جائے تو اسے رد نہ کرتے تھے۔ پہننے کے لیے اچھا کپڑا مل جائے تو اسے پھینک نہ دیتے تھے۔ مسلمانوں میں افراط و تفریط ہے ایک گروہ تو دنیا کی آسائش کی تلاش میں اتنا منہمک ہوا ہے کہ اس سے اوپر نظر نہیں اٹھتی اور ایک گروہ وہ بھی ہے جو صاف کپڑا رکھنا، صاف جسم رکھنا یا اچھا کھانا کھانا حرام سمجھتا ہے۔ قیامت کے دن نعماء خاص طور پر مومنوں کا ہی حصہ ہیں یعنی کافر اس دن نعماء سے متمتع نہ کیے جائیں گے یا خَالِصَةً سے یہ مراد ہے کہ اس دنیا میں نعماء کے ساتھ رنج اور حزن کی باتیں بھی ملی ہوتی ہیں۔ نعمائے قیامت ان سے پاک ہوں گی۔ تعلق اس آیت کا اصل مضمون سے یہ ہے کہ وحی الٰہی اچھی چیزوں کو حرام نہیں کرتی بلکہ اچھی چیزوں کی طرف ہدایت کرتی ہے۔

1074 - اس میں بتایا کہ وحی الٰہی صرف ان چیزوں سے روکتی ہے جو یا خود بری ہیں یا ان کا انجام برا ہے۔ اول فواحش یعنی بے حیائی کی باتوں کا ذکر کیا خواہ وہ علانیہ کی جائیں یا چھپ کر مثلاً زنا اور اس کے مبادی سب فواحش میں داخل ہیں علی الاعلان ہوں یا چھپ

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور ہر ایک قوم کے لیے ایک میعاد ہے، پھر جب ان کی میعاد آ پہنچتی ہے تو ایک گھڑی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ پہلے جاسکتے ہیں۔ (1075)

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾

اے بنی آدم! اگر کبھی تمہارے پاس تمہی میں سے رسول آئیں میری آیات تم پر بیان کریں تو جو کوئی تقویٰ کرے اور اصلاح کرے ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے۔ (1076)

کر خواہ کوئی دیکھتا ہو یا نہ دیکھتا ہو۔ پھر اِثْمٌ کا یعنی جسے انسان کی ضمیر بتادیتی ہے کہ وہ برا کام ہے یا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اور پھر بَغْیٌ کا یعنی دوسرے لوگوں پر زیادتی۔ اِثْمٌ کا اثر لازماً دوسرے پر نہیں۔ بَغْیٌ صرف دوسروں پر زیادتی ہے۔

1075 - ﴿لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ﴾ کے معنی پیچھے رہنے کا ارادہ نہ کریں گے اور ﴿لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ آگے جانے کا ارادہ نہ کریں گے۔ (غ) یعنی وقت مقرر سے پہلے بھی وہ عذاب نہیں آسکتا اور جب آجائے تو ٹل بھی نہیں سکتا۔

1076 - **رسولوں کے بھیجنے کا عام قانون اور ختم نبوت:** یہاں اور اس سے پیشتر چند باتیں عام طور پر ساری نسل انسانی کو مخاطب کر کے کہی ہیں۔ ﴿يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا﴾ [الأعراف: 26:7] ''اے بنی آدم! بے شک ہم نے تم پر لباس اتارا۔'' ﴿يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ﴾ [27] ﴿يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ﴾ [31] اور یہاں ﴿يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ﴾ جس کا مطلب یہ ہے کہ لباس سارے بنی آدم کے لیے ہے۔ شیطان کے فتنہ سے سب بنی آدم کو متنبہ کیا ہے۔ سب بنی آدم کو خدا کی عبادت کرتے وقت زینت اختیار کرنے کو کہا اور بالآخر سب بنی آدم کو بتایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی اپنا رسول بھیجے تو اس کو قبول کرنا چاہیے کیونکہ رسولوں کو قبول کرنے سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے اور ان کا رد کرنا موجب خسران ہے۔ بعض ختم نبوت کے منکر اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اس کے ماتحت آنحضرت ﷺ کے بعد بھی رسول آتے رہنے چاہئیں۔ اس آیت سے رسولوں کے آنحضرت ﷺ کے بعد آنے کا نتیجہ اول بہاء اللہ نے اور بعد میں ان کی نقل کر کے میاں محمود احمد قادیانی کے مریدوں نے نکالا ہے۔ حالانکہ اس آیت کو نہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے خود اور نہ ان کی زندگی میں ان کے مریدوں نے کبھی پیش کیا۔ ایک شرطیہ جملہ سے یہ نتیجہ نکالنا کمال نادانی ہے۔ مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ اگر بنی آدم کے پاس خدا کا رسول آئے تو اس کو قبول کرنے میں ان کی بہتری ہے۔ سو وہ رسول محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ کی ذات بابرکات کے متعلق یہ اعلان ہے کہ اگر اس کو قبول کرلو گے تو تمہاری بہتری کا موجب ہے اگر رد کرو گے تو تمہارے نقصان کا موجب ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلائیں اور ان سے تکبر کریں وہ آگ والے ہیں اسی میں رہیں گے۔ (1077)

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ

پھر اُس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے۔ ان لوگوں کو ان کا حصہ نوشتہ سے

اور اگر کہا جائے کہ رسل کا لفظ جمع کیوں استعمال کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لیے کہ خطاب کل بنی آدم کو ہے اور بنی آدم کی طرف رسول بھیجنے کا عام ذکر ہے۔ تو بلاشبہ آنحضرت ﷺ سے پہلے بنی آدم کے پاس رسول آتے رہے اور سب سے آخر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھیجا گیا کہ دنیا کہ کل قوموں کو ایک سلسلہ اخوت میں منسلک کریں اور اس بات کی شہادت کہ آپ کے بعد رسول نہ آئیں گے، دوسری جگہ ملتی ہے جہاں فرمایا ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ [المآئدة: 3:5] آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ رسول تو دین سکھانے کے لیے آتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کر کے پہنچا دیا تو پھر رسولوں کے آنے کی **ضرورت بھی باقی نہ رہی**۔ جب کمال شریعت اور شریعت کے آنے کے لیے مانع ہو گیا تو کمال نبوت بھی اور نبی کے آنے کے لیے مانع ہو گیا۔ جو ضرورت تھی پوری ہو گئی۔ آفتاب رسالت شمس نصف النہار کی طرف چمک رہا ہے اس لیے اب کسی رسول کی ضرورت دنیا کو نہیں۔ اور وہ لوگ جو رسول کے آنے کا جواز نکالتے ہیں مگر شریعت کا آنا نہیں مانتے ان کے لیے خود یہاں لفظ موجود ہیں ﴿يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ﴾ یعنی رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام بھی لائیں گے وہی پیغام شریعت ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ کسی پہلے رسول کی آیات ہیں تو پھر تکذیب تو ان آیات کی ہے۔ دیکھو اگلا نوٹ، ایسے رسول کی تکذیب کوئی شے نہ ہوئی۔

1077 - **رسول کے ساتھ پیغام کا آنا ضروری ہے:** اس آیت سے صاف شہادت ملتی ہے کہ رسولوں کے آنے سے مراد ایسے رسولوں کا آنا ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام بھی ہوتا ہے چنانچہ جس طرح پہلے فرمایا تھا ﴿اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى﴾ [البقرة: 38:2] ''میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے۔'' اور اس کے متعلق دو گروہوں کا ذکر کیا ایک ﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ﴾ اس ہدایت کی پیروی کرنے والے اور دوسرے ﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ﴾ [البقرة: 39:2] یعنی اس ہدایت، اس پیغام کا انکار کرنے والے اسی طرح یہاں دو گروہ ہیں۔ ایک اصلاح کرنے والے، دوسرے آیات یعنی پیغام الٰہی کی تکذیب کرنے والے۔ پس دونوں آیتوں کا مطلب ایک ہے اور دونوں گروہوں کی جزا کا ذکر یکساں الفاظ میں ہے۔ دونوں میں سزا تکذیب پیغام کی ہے۔ اور رسولوں کے ختم ہو جانے پر واقعات عالم بھی گواہ ہیں جس قسم کے لوگ پہلے آیا کرتے تھے اور ایک عالم کو اپنے پیچھے لگا لیتے تھے اب تیرہ سو سال سے اس قسم کا کوئی انسان دنیا میں ظاہر نہیں ہوا۔

نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْۤا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

ملتا رہے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس آئیں گے کہ ان کو وفات دیں کہیں گے وہ کہاں ہیں جن کو اللہ کے سوائے تم پکارتے تھے؟ کہیں گے وہ ہم سے جاتے رہے اور اپنی جانوں پر گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ (1078)

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِى النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

کہے گا ان قوموں میں جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں سے گزر چکیں آگ کے اندر داخل ہو جاؤ۔ جب کبھی کوئی جماعت داخل ہوگی اپنی ساتھی (قوم) پر لعنت کرے گی۔ یہاں تک کہ جب سب اس کے اندر ایک دوسرے کو پالیں گے ان کے پچھلے ان کے پہلوں کو کہیں گے اے ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا سو ان کو دو چند عذاب آگ کا دے۔ کہے گا ہر ایک کے لیے دو چند ہے لیکن تم نہیں جانتے۔ (1079)

1078 - ﴿نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ کتاب بمعنی مکتوب بھی ہوسکتا ہے یعنی جو حصہ ان کے لیے لکھا گیا ہے۔ مگر اَلْكِتٰبُ سے مراد یہی قرآن بھی ہوسکتا ہے یعنی وہ قرآن کو رد کر کے اس حظ سے بہرہ ور ہوں گے جو رد کرنے والوں کے لیے قرآن نے قرار دیا ہے۔

﴿شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ﴾ اپنے نفسوں پر شہادت دینے سے مراد یہ ہے کہ الزام قبول کرلیں گے اور اپنے گناہوں کا اقرار کرلیں گے یا یہ کہ ان کی حالت خود بتادے گی کہ وہ کافر تھے۔ اور جو طاقتیں انسان کی ترقی کے لیے انسان کے اندر ودیعت کی گئی تھیں ان کو انہوں نے دبایا۔

1079 - اُخْتَهَا۔ اَخٌّ اور اُخْتٌ کا لفظ ہر قسم کی مشارکت پر بول دیا جاتا ہے۔ خواہ وہ ولادت کے لحاظ سے ہو یا رضاعت کے لحاظ سے یا دین یا صنعت یا معاملہ یا دوستی کے لحاظ سے۔ کفر میں شریک بھی سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اسلام میں شریک بھی سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہاں اُخْتَهَا بلحاظ سیاق ان کے اولیاء ہیں۔ (غ) یا یہ کہ تابع متبوع پر لعنت کریں گے اور

وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع 4 8 11

اور ان کے پہلے ان پچھلوں کو کہیں گے تم کو ہم پر کوئی فوقیت نہیں، سو اس کے بدلے میں جو تم کماتے تھے عذاب چکھو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان سے سرکشی اختیار کرتے ہیں ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو۔ اور اسی طرح ہم مجرموں کو سزا دیتے ہیں۔ (1080)

متبوع تابع پر۔

اُخْرٰىهُمْ۔ اُوْلٰىهُمْ سے پچھلے اور پہلے بلحاظ مرتبہ مراد ہیں یعنی تابع اور متبوع یا ضعفا اور کبرا۔

﴿لِكُلٍّ ضِعْفٌ﴾ یعنی اگر متبوع زیادہ عذاب کے مستحق ہیں اس لیے کہ انہوں نے دوسروں کو گمراہ کیا۔ تو تابع بھی زیادہ کے مستحق ہیں، اس لیے کہ انہوں نے آنکھیں بند کر کے تقلید کی۔ دوسری **توجیہ دو چند عذاب** کی یہ ہے کہ ظاہر و باطن کا عذاب مراد ہے۔ یوں ہر ایک کے لیے اس کا دو چند ہے جو نظر آتا ہے گو دوسرا نہ جانتا ہو۔ امام راغب نے یہی معنی لیے ہیں۔

1080- ﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ﴾ مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال اوپر نہیں جاتے یا ان کی ارواح کا رفع نہیں ہوتا۔ صالح عمل کو اللہ تعالیٰ رفع دیتا ہے ﴿وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ﴾ [فاطر: 10:35] ''اور نیک عمل اس کو بلند کرتا ہے۔'' ایسا ہی مومنوں کو اللہ تعالیٰ رفع دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا اسم اَلرَّافِعُ ہے۔ اس لیے خواہ یہاں کفار کے اعمال مراد لیے جائیں یا ان کی ارواح، مطلب ایک ہی ہے ان کو رفع عطا نہیں ہوتا۔ اسی لحاظ سے فرمایا کہ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔

جَمَلُ۔ جَمَال حسن کو کہتے ہیں اور جَمَل اونٹ کو اس لیے کہ وہ اونٹ کو اپنے لیے خوبصورتی کا موجب سمجھتے تھے۔ اس کی جمع جِمَالَةٌ قرآن شریف میں آتی ہے ﴿كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ [المرسلات: 33:77] ''گویا وہ زرد اونٹ ہیں۔'' اور جمال بھی آتی ہے۔

سَمّ۔ تنگ سوراخ کو کہتے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ، یا ناک یا کان میں جو چھید کیا جاتا ہے اور سُمّ زہر کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور سَمُوْمٍ تیز گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کا سا اثر رکھتی ہے۔ ﴿فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ﴾ [الواقعة: 42:56] ''لُو میں اور ابلتے ہوئے پانی میں۔'' ﴿وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝﴾ [الحجر: 27:15] ''اور جنوں کو ہم نے (اس سے) پہلے تیز آگ سے پیدا کیا۔'' (غ)

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

ان کے لیے جہنم کا بچھونا ہے اور ان کے اوپر (اسی کے) اوڑھنے اور اسی طرح ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔ (1081)

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں ہم کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتے مگر اس کے مقدور کے مطابق، یہی جنت والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔

وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ

اور جو کچھ ان کے سینوں میں رنج ہوں گے ہم نکال دیں گے۔ (1082) ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو اس کے لیے ہدایت دی اور ہم تو ہدایت نہ پاسکتے اگر اللہ ہم کو

﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ جمل یا اونٹ کو عرب میں بڑائی کے لیے بطور مثال بیان کرتے ہیں اور سوئی کے ناکے کو تنگیٔ مسلک میں۔ یہاں یہ بتایا کہ ان کے اعمال نے ان کے لیے جنت میں داخل ہونا ایسا ہی مشکل کر دیا ہے جیسا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا مشکل ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو وہاں پہنچا دے یا سزا دینے کے بعد تو یہ اور معاملہ ہے۔

اصل غرض بمقابلہ ردّ کرنے والوں کے وحی کو قبول کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اس مقابلہ کے اظہار کے لیے پہلی دو آیتوں میں پچھلے رکوع کے مضمون کو جاری رکھا ہے۔

1081 - غَوَاشٍ۔ غَاشِيَةٌ کی جمع ہے ڈھانکنے والی چیز اور ایسی مصیبت کو بھی کہا جاتا ہے جو ڈھانک لے ﴿تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ﴾ [یوسف: 107:12] ''ان پر بھاری مصیبت آ پڑے۔'' اور قیامت کو بھی ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۘ﴾ [الغاشية: 1:88] ''کیا تیرے پاس ڈھانک لینے والی کی خبر آئی ہے؟''

جہنم کے اوڑھنا اور بچھونا ہونے سے مراد یہ ہے کہ چاروں طرف سے عذاب ان پر محیط ہوگا۔

1082 - غِلٍّ کے معنی عداوت ہیں۔ (غ) یا کینہ، رنج، حسد۔

نعمائے دنیا کے ساتھ یہ بھی لگا ہوا ہے کہ سینوں میں کسی قدر غل وغش رہتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کینہ یا حسد ہوتا ہے۔ جنت کی نعماء کے ساتھ یہ باتیں نہ ہوں گی۔ درجات میں اگر ایک دوسرے سے بلند بھی ہوں گے تو بھی دلوں میں کوئی حسد نہ

جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْٓا اَنْ
تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ
الثلثة تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

ہدایت نہ دیتا۔ یقیناً ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ آئے۔ اور انہیں پکارا جائے گا کہ اس جنت کا تم کو اس کے بدلے وارث بنایا گیا جو تم کرتے تھے۔ (1083)

وَ نَادٰۤی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ
قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ
وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا
نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ
اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾ۙ

اور جنت والے آگ والوں کو پکاریں گے کہ بے شک ہم نے جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا سچ پایا۔ تو کیا تم نے بھی جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا سچ پایا؟ کہیں گے ہاں! تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ
وقف لازم باختلاف یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ
كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ۘ

جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں۔ (1084)

ہوگا۔ وہ نعماء ہر قسم کی ردی آمیزش سے پاک ہوں گی اور یا یہ مراد ہے کہ مومنوں میں بھی بعض وقت غلط فہمیوں سے ایک دوسرے سے رنج ہو جاتا ہے۔ قیامت میں وہ نہ ہوگا۔

1083 - اُوْرِثْتُمُوْهَا۔ وِرَاثَةٌ اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ کوئی مال کسی غیر سے بلا کسی عہد کے یا بلا ایسی چیز کے جو عہد کے قائمقام ہو پہنچے۔ پھر اس کا استعمال ایسے مال پر ہوتا ہے جو میت سے پہنچتا ہے۔ اور ایسے حصول مال پر بھی ہوتا ہے جو بلا مشقت ملے۔ اور ایسا ہی جب کسی کو کوئی نعمت عطا کی جائے جو اس کے لیے خوشگوار ہو۔ (غ) یہاں جنت کو مومن کے لیے ورثہ بتانے میں یہ اشارہ ہے کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے۔ اعمال کا بدلہ بھی ساتھ فرمایا مگر سچ یہی ہے کہ اعمال صالحہ جو انسان کرتا ہے تو وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ ان پر نعماء کا عطا کرنا یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

1084 - عِوَجٌ۔ عِوَجٌ وہ ٹیڑھا پن ہے جو آنکھ سے نظر آجائے اور عَوَجٌ وہ جو بصیرت سے معلوم ہو۔ ﴿یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین کو استقامت دی ہے تو یہ اس حالت سے اس کو بدلنا چاہتے ہیں۔

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫

اوران کے درمیان ایک پردہ ہوگا[1085] اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو سب کو ان کے نشانوں سے پہچانتے ہوں گے[1086] اور وہ جنت والوں کو پکاریں گے کہ تم پر سلامتی ہو

1085 - یعنی اہل جنت اور اہل نار کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ پس وہاں کے حواس الگ ہی ہیں اور وہاں کی کیفیات بھی الگ ہیں۔ دونوں کے درمیان پردہ بھی حائل ہے بایں ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھتے بھی ہیں۔ یہاں کے مکان کی کیفیات وہاں کے مکان کی کیفیات نہیں۔ نیز [دیکھو نمبر: 1838]

1086 - اَلْاَعْرَافِ۔ عُرْفٌ کی جمع ہے اور وہ ہر ایک بلند مرتفع مکان کو کہتے ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ اعراف وہ بلند مکان ہیں جو دیوار کے اوپر ہوں اور ایسا ہی جو بلند زمین ہو وہ بھی عُرْفٌ کہلاتی ہے۔ اور ہواؤں اور بادلوں کے اَعْرَافٌ وہ ہیں جو پہلے آئیں اور جو بلند ہوں۔ (ل)

سِيْمَا۔ سَامَ سے ہے اور اس کے معنی علامت ہیں۔

اصحاب اعراف کون لوگ ہیں؟

اکثر مفسرین کا یہ خیال ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں اور وہ اعراف کو حجاب قرار دیتے ہیں۔ جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے۔ مگر لفظ کے لغوی معنی کی رو سے یہ تاویل درست معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اعراف بلند مقاموں کا نام ہے۔ دوسرے ان کے مرتبہ کی بلندی اس سے ظاہر ہے کہ وہ سب کو پہچانتے ہیں یعنی اہل دوزخ کو اور اہل جنت کو نشانوں سے پہچانتے ہیں یہ ان کی معرفت بلند کا نتیجہ ہے۔ تیسرے ان کو رجال کہا ہے۔ اگر وہ گروہ مراد ہوتا ہے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہیں تو رجال کی خصوصیت کے کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ ایسی عورتیں بھی ہوں گی اور مرد بھی ہوں گے۔ رجال کی خصوصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسل اور انبیاء کا گروہ ہے۔ کیونکہ رسالت مردوں سے مخصوص رہی ہے اور لسان العرب میں ایک قول اصحاب الاعراف کے متعلق یہ بھی منقول ہے کہ وہ انبیاء ہیں۔ اور گو ایک گروہ مفسرین کا اس طرف بھی گیا ہے کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں۔ مگر اس میں بھی رجال کے لفظ کی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ پس حق یہی ہے کہ یہ انبیاء کا گروہ ہے جو اپنی امتوں کو پہچانتے ہیں کہ کون جنت میں جائیں گے اور کون دوزخ میں؟ اس کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ انبیاء کو ایک خصوصیت دی گئی ہے کہ انہیں اپنی اپنی امتوں پر شہید کہا گیا ہے ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ﴾ [النسآء: 41:4] ''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے۔'' اور یہ ایک الگ ہی گروہ قرار دیا گیا ہے۔ ہاں امت محمد یہ کو یہ فضیلت دی گئی ہے کہ اس کے کامل الایمان لوگوں کو بھی اس گروہ میں داخل کیا ہے جیسے فرمایا ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ

لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

وہ ابھی اس میں داخل نہیں ہوئے اور وہ امید رکھتے ہوں گے۔ (1087)

وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ ع 5 8 12

اور جب ان کی آنکھیں آگ والوں کی طرف پھریں گی۔ کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ظالم قوم کے ساتھ نہ کیجیو۔ (1088)

وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور اعراف والے کچھ مردوں کو پکاریں گے جن کو وہ ان کے نشانوں سے پہچانتے ہوں گے کہیں گے تم کو تمہاری جمعیت نے کچھ فائدہ نہ دیا اور (نہ) اس نے جو تم تکبر کرتے تھے۔ (1089)

عَلَى النَّاسِ﴾ [البقرة: 143:2] ''تاکہ تم لوگوں کے پیشرو بنو'' اور اسی کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے دوسری جگہ تین گروہ ہی بنائے ہیں۔ ایک سابقون یا مقربوں کا گروہ، ایک اصحاب الیمین یا اہل جنت کا گروہ۔ ایک اصحاب الشمال یا اہل دوزخ کا گروہ دیکھو [سورة الواقعة: 7 تا 10] اس لیے یہاں اہل جنت اور اہل نار کے علاوہ جس تیسرے گروہ کا ذکر ہوسکتا ہے وہ یہی سابقین اور مقربین کا گروہ ہے۔ اور لسان العرب میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ اس قول کے کیا معنی ہیں [اَهْلُ الْقُرْاٰنِ عُرَفَآءُ اَهْلِ الْجَنَّةِ؟] تو آپ نے فرمایا: [رُءُوْسَآءُ اَهْلِ الْجَنَّةِ] یعنی عرفا سے مراد سردارانِ اہل جنت ہیں۔

1087 - یعنی اہل جنت ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہاں امیدوار ہیں لیکن یہ مقربین کا گروہ چونکہ بلند مقام پر ہے اس لیے اہل جنت کو پہچانتا ہے۔

1088 - یہ اس لیے کہیں گے کہ ابھی وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے ﴿صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ﴾ میں انہی اہل جنت کا ذکر ہے۔

1089 - جَمْعُكُمْ سے مراد جمعیت بھی ہوسکتی ہے اور مال و دولت کا جمع کرنا بھی۔ یہ الفاظ کہ اعراف والے دوزخ والوں میں سے خاص لوگوں کو پکاریں گے اور ان کی جمعیت اور ان کا تکبر یاد دلائیں گے۔ اسی نتیجہ کی مؤید ہے جس پر ہم اوپر پہنچے ہیں کہ اصحاب اعراف سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں اور وہ رجال جن کو وہ پکاریں گے وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں اپنے مال اور جتھے کو حق کی مخالفت پر لگایا۔ ان لوگوں کو جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں حق کے ان مخالفین سے کیا تعلق اور ان کے انہیں پہچاننے کا کیا مطلب؟ ہاں انبیاء ان کو پہچانتے ہوں گے اس لیے کہ ان کی مخالفت ان لوگوں نے کی اور اگلی آیت میں اپنے متبعین کا ذکر

اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

کیا یہ وہی ہیں جو تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ ان پر رحمت نہیں کرے گا؟ جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم پچھتاؤ گے۔ (1090)

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ۙ

اور آگ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ ہم پر کچھ پانی بہاؤ یا اس سے (دو) جو اللہ نے تم کو رزق دیا ہے۔ کہیں گے اللہ نے ان کو کافروں پر حرام کیا ہے۔ (1091)

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

جنہوں نے اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنایا اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا سو آج ہم ان کو چھوڑ دیں گے جس طرح وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے اور اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ (1092)

کرتے ہیں۔

1090 - یہ اہل جنت کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جواب جنت میں جا رہے ہیں ان کے متعلق تم کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں کرے گا کیونکہ مخالفین حق مومنوں کو ذلیل سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس قسم کے اقوال دوسری جگہ موجود ہیں ﴿اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا﴾ [الأنعام: 53:6] ''کیا یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان کیا ہے؟'' یعنی استہزا کے طور پر ان کو کہتے تھے کیونکہ وہ غریب تھے۔ آیت کے پچھلے حصہ میں خطاب اہل جنت کو کرتے ہیں جو ان انبیاء کے پیرو ہیں۔

1091 - جو لوگ اس دنیا میں کھانے پینے کے ہی خیال میں منہمک رہے وہاں بھی یہی خیال سر میں رہے گا اور ان کو جواب یہ دیا گیا ہے کہ وہ رزق اب مانگنے سے نہیں مل سکتا۔ ان کے قویٰ ہی اس قابل نہیں کہ وہ روحانی ثمرات حاصل کریں جن کا موقعہ انہوں نے خود گنوا دیا۔ وجہ اگلی آیات میں بتائی ہے۔

1092 - یعنی دنیا میں ان کو موقع دیا گیا تھا جس کو انہوں نے ضائع کر دیا، دین کو ایک کھیل سمجھا اور حیوانی خواہشات پر ہی گرے رہے۔

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور یقیناً ہم نے ان کو کتاب دی جسے ہم نے علم کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع 6 6 13

کیا وہ اس کے (بتائے ہوئے) انجام ہی کا انتظار کرتے ہیں؟ جس دن اس کا (بتایا ہوا) انجام آئے گا وہ لوگ جنہوں نے اسے پہلے بھلا رکھا تھا کہیں گے بے شک ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ آئے۔ پس کیا ہمارے کوئی سفارشی ہیں جو ہمارے لیے سفارش کریں یا ہم لوٹائے جائیں تو (اور) عمل کریں اس کے خلاف جو ہم عمل کرتے تھے انہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور وہ جو افترا کرتے تھے ان سے جاتا رہا۔ (1093)

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ وقتوں میں پیدا کیے۔ (1094)

اس لیے ان کے روحانی قویٰ مر گئے اور وہ اس رزق کے اہل ہی نہیں رہے گویا اہل جنت بخل نہیں کرتے بلکہ انہیں بتاتے ہیں کہ وہ رزق تو خاص قویٰ کے حصول سے مل سکتا ہے مگر تم نے خود دنیا میں ان قویٰ کو بے کار کر دیا۔ نسیان کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 67]۔

1093 - تَاْوِيْل کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 376]۔ یہاں مراد اس کا بیان کردہ انجام ہے یعنی وہ وعید جو اُن کو دیئے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اصلاح کا وقت تو یہی ہے کہ وعید کے آنے سے پہلے پہلے کر لے۔ جب بدی کا انجام بد ظاہر ہو گیا تو پھر وہ ٹل کس طرح سکتا ہے؟

1094 - يَوْمَ کے معنی [نمبر: 3] میں بیان ہو چکے ہیں۔ ایک لمحہ سے لے کر پچاس ہزار سال کو بھی یوم کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ یوم جس کو ہم دن کہتے ہیں جو آفتاب کے طلوع اور غروب سے تعلق رکھتا ہے وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد ظہور میں آیا۔ پس آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے ذکر میں کبھی بھی مراد چوبیس گھنٹے کا دن رات نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے عام معنی وقت ہی مراد

عَلَى الْعَرْشِ ۘ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ پھر وہ عرش پر متمکن ہے۔[1095] رات کو دن کا لباس

ہیں جو تمام حد بندیوں سے آزاد ہے۔

آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنے سے مراد:

اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ وہ حق جو وحی لائی ہے ضرور کامیاب ہوگا۔ مگر اس کی ترقی جیسا کہ قدرت کے تمام نظارہ میں ہے تدریجی ہوگی۔ اور اس لیے ابتدا یوں کی کہ آسمانوں کو اور زمین کو بھی اللہ تعالیٰ نے چھ وقتوں میں پیدا کیا یعنی ان کی پیدائش کی جو آخری حالت ہے چھ زمانوں چھ حالتوں سے گزار کر ان کو اس حالت تک پہنچایا۔ ان معنوں کی صحت پر یہ امر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ المومنون کے پہلے رکوع میں انسان کی پیدائش کے بھی چھ ہی مراتب بیان کیے ہیں۔ نطفہ، علقہ، مضغہ۔ مضغہ میں ہڈیوں کا پیدا ہونا، پھر سارے اعضا کا ٹھیک ہو کر ہڈیوں پر گوشت کا چڑھ جانا، پھر اس میں زندگی کا پیدا ہونا اور اس کے مقابل پر وہیں یعنی [المؤمنون: 23:1-9] میں چھ ہی مراتب خلق روحانی کے بیان فرمائے ہیں۔

زمین کی پیدائش کو اگر لیا جائے تو سائنس سے موجودہ حالت تک پہنچنے میں چھ مرتبے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک وہ حالت جب یہ انگارے کی صورت میں تھی۔ دوسری وہ حالت جب وہ انگارا ٹھنڈا ہونا شروع ہوا اور پانی وغیرہ الگ ہوئے۔ تیسری وہ حالت جب اس کی سطح کا اوپر کا حصہ کافی موٹا ہو گیا اور پہاڑ وغیرہ بن گئے۔ چوتھی وہ حالت جب نباتات بنیں۔ پانچویں وہ حالت جب حیوانات پیدا ہوئے۔ چھٹی وہ حالت جب خلاصہ مخلوقات انسان بنا۔ اسی طرح زمین و آسمان کی ہر چیز کی پیدائش میں چھ مرتبے نظر آتے ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بھی چھ مرتبے بتائے گئے ہیں۔ یعنی اول مٹی کا پیدا ہونا، پھر اس میں پہاڑوں کا بننا، پھر درختوں کا پیدا ہونا، پھر مکروہات کا پیدا ہونا، پھر نور کا پیدا ہونا، پھر جانداروں کا پیدا ہونا، پھر انسان کا پیدا ہونا۔ اور [يَوْمُ الْاَحَدِ يَوْمُ الْاِثْنَيْنِ] وغیرہ کا جو ذکر بعض روایات میں ہے تو اس سے مراد واقعی یہی اتوار پیر وغیرہ کے ایام نہیں بلکہ پہلا دوسرا دن مراد ہیں اور [يَوْمُ الْجُمُعَةِ] سے مراد جمع ہونے کا دن ہے یعنی جس میں آدم کی پیدائش کی وجہ سے ساری مخلوقات جمع ہو گئی۔ ابن جریر میں ایسی ہی ایک روایت کے بعد یہ لفظ آتے ہیں کہ ان چھ دنوں میں سے ہر دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا یہ دن مراد کبھی نہیں لیے گئے بلکہ اس سے مراد چھ اور زمانے ہیں، خواہ وہ ایک ہزار سال کے ہوں، خواہ پچاس ہزار کے، خواہ دس لاکھ کے۔

1095 - اِسْتَوٰی کے لیے [دیکھو نمبر: 44]۔ اس کا استعمال ایک چیز پر اس کی اپنی ذات میں حالت اعتدال پر ہونے پر ہوتا ہے ﴿فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ﴾ [المؤمنون: 28:23] ''پس جب تم بیٹھ جاؤ۔'' ﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ﴾ [الزخرف: 13:43] ''تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر سوار ہو۔'' ﴿فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ [الفتح: 29:48] ''پھر اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔'' اس معنی میں اسْتَوٰی کے معنی متمکن اور مضبوط ہونا ہو سکتے ہیں یا قرار پکڑنا۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اسْتَوٰی کا صلہ علٰی ہو تو اس کے معنی استیلاء یا غالب ہونا ہوتے ہیں اور ﴿اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ کے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ [اِسْتَوٰى لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي

يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا

پہناتا ہے وہ اس کے پیچھے لگا تار چلا آتا ہے اور سورج اور چاند، ستارے اس کے حکم سے کام میں لگائے گئے ہیں۔

الْاَرْضِ اَیْ اِسْتَقَامَ الْکُلُّ عَلٰی مُرَادِہٖ بِتَسْوِیَۃِ اللّٰہِ تَعَالٰی اِیَّاہُ] یعنی ''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس کے لیے حالت اعتدال میں ہو گیا یا اس کے ارادہ کے مطابق حالت استقامت میں ہو گیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اعتدال پر بنایا۔'' (غ)

الْعَرْش۔ راغب کہتے ہیں کہ عرش اصل میں مسقّف چیز کو کہتے ہیں اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ یعنی تخت کو عرش اس کے علو کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ اس سے مراد عِزّ یعنی غلبہ اور سلطان اور مملکت بھی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے [ثُلَّ عَرْشُہٗ] جیسا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے اور مراد اس سے لی جاتی ہے کہ اس کا غلبہ اور قدرت جاتی رہی۔ اور پھر لکھتے ہیں کہ اللہ کا عرش ایک ایسی چیز ہے جس کو فی الحقیقت کوئی بشر نہیں جانتا۔ اور جو عوام الناس کا وہم ہے وہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں عرش اللہ تعالیٰ کو اٹھانے والا ہوتا۔ حالانکہ اللہ کی ذات اس سے پاک ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض کے نزدیک ذُوالْعَرْش وغیرہ میں عرش سے مراد اس کی مملکت اور غلبہ ہے نہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ۔ جس سے وہ پاک ہے۔

﴿اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ سے کیا مراد ہے؟ سو اول الفاظ کے استعمال سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ وہی لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو انسان کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا کے بھی ہاتھ ہیں، وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے مگر اس کو انسانوں کے ہاتھوں پر، ان کے سننے پر، ان کے دیکھنے پر قیاس کرنا صریح غلطی ہے۔ اسی طرح اگر ایک عرش بادشاہ کا ہے اور ایک عرش خدا کا ہے تو ان دونوں سے ایک ہی معنی تخت مراد لینا صریح غلطی ہے۔ بادشاہ کی بادشاہت تخت سے وابستہ ہے مگر خدا کی بادشاہت ان باتوں سے پاک ہے۔ بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے سے مراد صرف اس قدر ہوتی ہے کہ اس کی قدرت اور حکومت کا نفاذ ہو گیا۔ یہی مراد نہ تخت پر بیٹھنے کا ظاہری فعل خدا کے ﴿اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ سے ہو سکتی ہے۔ [دیکھو نمبر: 27] جہاں دکھایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف الفاظ منسوب ہوں تو جو ان میں آلہ یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا بلکہ صرف فعل کی آخری غرض منسوب ہوتی ہے اور چونکہ انسان کے لیے ﴿اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ سے مراد تخت پر بیٹھنے کے ذریعہ سے اس کی حکومت کا نفاذ پانا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا ﴿اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ صرف نفاذ حکومت و قدرت ہے۔

قرآن کریم کو دیکھیں تو خود اپنے مطلب کو واضح کر دیا ہے۔ سورۂ یونس میں فرمایا ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ [3:10] ''پھر وہ عرش پر غالب ہے ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔'' جہاں ﴿اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ کی تفسیر خود ہی ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ سے فرما دی۔ یعنی تدبیر امور کرتا ہے۔ پھر خاص اس موقعہ پر پہلے زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر ہے پھر ﴿اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ کا اور آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر ہے ﴿لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے اور امر بھی اسی کا جس سے صاف معلوم ہوتا

لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

سن لو بنانا اور حکم دینا اسی کا کام ہے۔ اللہ بابرکت ہے جو جہانوں کا رب ہے۔ (1096)

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ ۚ

اپنے رب کو عاجزی سے اور چھپ کر پکارو۔ وہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ (1097)

ہے کہ ﴿اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ میں امر الٰہی کے نفاذ کا ذکر ہے اور خود طرز بیان بھی اسی کو چاہتی ہے۔ کیونکہ پیدا کرنا ایک کام ہے اور پیدائش میں نفاذ امر دوسرا کام۔ قدرت دونوں سے کامل ہوتی ہے پیدا بھی کرے اور اسی کا امر بھی اس میں نفاذ پائے۔ یہی معنی قفال نے کیے ہیں۔ (ر)

کرسی اور عرش دونوں کے متعلق عوام میں ایک غلط فہمی ہے۔ اول الذکر کو بخاری نے رفع کر دیا ہے کیونکہ انہوں نے کرسی کے معنی علم کیے ہیں [دیکھو نمبر: 329ب]۔ اس سے بھی عرش کے معنی قدرت یا نفاذ امر کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر کرسی سے مراد علم ہے تو عوام کا خیال تو خود باطل ثابت ہوا۔ مشہور معنی کے لحاظ سے جس قدر روایات بیان کی جاتی ہیں ان کو بیہقی نے بیان کر کے سب کو ضعیف قرار دیا ہے دیکھو روح المعانی۔ اور اس پر ایک یہ بھی شہادت ہے کہ قرآن کریم میں یہ بار بار ذکر ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ تعالیٰ کا ہے اور کہ اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ مگر یہ کہیں نہیں کہ جو کچھ کرسی اور عرش میں ہے وہ بھی اس کا ہے یا وہ اسے جانتا ہے حالانکہ اگر کرسی اور عرش دو ایسے فلک ہوتے تو ایسا ذکر ضرور ہونا چاہیے تھا۔

1096 - حَثِيْثًا۔ حَثَّ کے معنی ہیں ملنے میں جلدی کرنا اور حَثِيْثٌ کے معنی ہیں جلدی کرنے والا۔ (ل)

مُسَخَّرٰتٍ۔ تَسْخِيْرٌ کے معنی ہیں غالب ہو کر کسی خاص غرض کی طرف چلانا۔ پس مسخر وہ ہے جو اس طرح کام میں لگا تا ہے۔ (غ) اور مسخر وہ جو اس طرح کام میں لگایا جائے اور سَخْرِيٌّ وہ ہے جس پر دوسرا غالب آ جائے پھر وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے ﴿لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ [الزخرف: 32:43] ''تا کہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔'' مگر یہ تسخیر سے بھی ہو سکتا ہے اور سَخْرِيَّةٌ سے بھی یعنی تمسخر کرنے سے۔ (غ)

تَبٰرَكَ۔ بَرَكَةٌ کسی چیز میں الٰہی خیر کا قائم ہو جانا۔ اور تبارک میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان خیرات کے ساتھ مخصوص ہے جن کا ذکر تبارک کے ساتھ ہے۔

رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں یہ اشارہ ہے کہ اس ظلمت کے بعد جو دنیا میں پھیل رہی ہے اب نور ظہور پذیر ہوگا۔ اسی مناسبت سے سورج اور چاند اور ستاروں کا ذکر ہے۔

1097 - اسلام پر مصائب کا زمانہ ہے۔ اس لیے دعا کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اب بھی مسلمان دعا کی طرف متوجہ ہوں تو مصائب سے

وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾

اور زمین کے اندر اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ اور خوف کرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اس کو پکارو۔ اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں سے قریب ہے۔ (1098)

وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوش خبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھالاتی ہیں ہم اس کو ایک مردہ زمین کی طرف چلاتے ہیں پھر ہم اس سے پانی اتارتے ہیں۔ پھر اس سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں اسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ (1099)

نکلیں۔ ﴿لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴾ میں بتایا کہ جو لوگ خدا کے حضور عاجزی سے دعا نہیں کرتے وہ دنیا میں ظلم اور زیادتی کرنے لگ جاتے ہیں۔ مگر زیادتی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ اس لیے تم ہمہ تن دعا کی طرف متوجہ ہو جاؤ تاکہ کامیاب ہو کر ظلم اور زیادتی سے بچو اور اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے۔ تضرع کی دعا وہ ہے جس میں انسان خدا کے حضور گڑگڑاتا اور زور سے دعا کرتا ہے۔ خفیہ یا چھپ کر دعا کرنا بھی اچھا ہے مگر دعا میں تضرع سے ایک خاص کیفیت انسان کے قلب پر پیدا ہوتی ہے۔

1098 - یہاں مخلوق خدا کے ساتھ نیکی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ مخلوق خدا کے ساتھ نیکی بھی رحمت الٰہی کی جاذب ہے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ کامیاب ہوں تو پھر فساد نہ پھیلائیں۔

1099 - اَقَلَّتْ۔ اس کا مادہ قِلَّۃٌ ہے۔ اور اَقْلَلْتُ کے معنی ہیں میں نے اسے تھوڑے بوجھ کا یا ہلکا پایا۔ اور یہ بعض وقت دوسری چیز کی قوت کی نسبت سے ہوتا ہے۔ پس اَقَلَّتْ کے معنی ہیں ہواؤں نے اسے اٹھایا اور اپنی قوت کے لحاظ سے اسے قلیل پایا۔ (غ) اس لفظ کے استعمال میں لطیف اشارہ ہے کہ ہواؤں میں کس قدر طاقت ہے جو لاکھوں اور کروڑوں من پانی کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہیں۔

قدرت کا ایک عام نظارہ بیان کر کے کہ ٹھنڈی ہوائیں کس طرح بارش کی خوش خبری لاتی ہیں، اپنی روحانی بارش کی طرف توجہ دلائی کہ اس کے آگے آگے بھی ٹھنڈی ہوائیں چلی آ رہی ہیں۔ یہ ٹھنڈی ہوائیں اسلام کی ہلکی ہلکی قبولیت کی خوشخبریاں ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ وقت بھی آتا ہے کہ یہ روحانی بارش ایک مردہ زمین پر پڑ کر اسے زندہ کر دے۔ ﴿كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی﴾ میں

وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝۵۸ ع 7 5 14

اور اچھی زمین کا سبزہ اس کے رب کے حکم سے (خوب) نکلتا ہے اور جو خراب ہے (وہاں) نکلتا بھی ہے تو ناقص۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے جو شکر کرتے ہیں بار بار باتیں بیان کرتے ہیں۔ (1100)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵۹

بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا سو اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں۔ میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (1101)

مضمون کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ اور اشارہ انہی مُردوں کی طرف ہے جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ﴾ [الأنعام: 122:6] ''اور کیا وہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا۔''

1100 - نَكِدَ۔ نَكَدَ یا نَكِدَ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے طالب کی طرف تنگی سے نکلتی ہے۔ (غ)

قبولیت حق میں اختلاف استعداد:

اس میں بتایا ہے کہ جس طرح پر ظاہر میں دیکھتے ہو کہ سب زمینیں یکساں نہیں۔ بارش تو ایک ہی سب پر ہوتی ہے مگر بعض کی استعداد قبولیت اچھی ہوتی ہے اور ان میں روئیدگی بھی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ بعض زمین ناقص ہوتی ہے اس لیے روئیدگی اس میں نکلے بھی تو نہایت قلیل اور مردہ سی کہ ترقی نہیں کرتی۔ اسی طرح طبائع انسانی کی استعداد میں اختلاف ہے۔ اپنی اپنی استعداد کے مطابق خدا تعالیٰ کی اس روحانی بارش سے فائدہ اٹھائیں گے۔ سب پر یکساں توقع غلط ہے۔

1101 - نُوْح۔ نبی کا نام ہے اور نَوحَ کے معنی نوحہ کرنا ہیں۔ (غ)

انبیاء کے ذکر کی غرض:

وحی الٰہی کے جھٹلانے کے برے نتائج سے قریش اور دشمنان اسلام کو آگاہ کر کے اب کچھ مثالیں پہلی تاریخ سے پیش کی ہیں کہ کس طرح جن لوگوں نے پہلے پیغمبروں کے ساتھ عداوت کر کے ان کو تباہ کرنا چاہا ان کا انجام خطرناک ہوا۔ پیغمبروں کا ذکر جو قرآن کریم میں آتا ہے اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قصوں کے رنگ میں نہیں اور اسی لیے ساری تفصیلات کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ صرف ان امور کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ سے اعدائے اسلام کو متنبہ کرنا مقصود ہو۔ مثلاً تعلیم میں سے عموماً یہ موٹا اصول لے لیا ہے جو سب انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں مشترک ہے کہ خدا ایک ہے اسی کی عبادت کرو، تقویٰ اختیار کرو، خلق خدا کے ساتھ نیکی

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾

اس کی قوم کے سرداروں نے کہا، ہم یقیناً تجھ کو کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾

اس نے کہا اے میری قوم! مجھ میں کسی طرح کی گمراہی نہیں لیکن میں جہانوں کے رب کا رسول ہوں۔ (1102)

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ سے کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (1103)

کرو۔ لوگوں نے کیا سلوک کیا، اس کی تفصیلات کو عموماً چھوڑ دیا ہے۔ امر مشترک کہ نبی کو جھوٹا کہا، اس کے تباہ کرنے کی کوشش کی، اس کی مخالفت پر کھڑے ہو گئے، اس کو بیان کر دیا ہے۔ اور پھر آخر بتا دیا ہے اعداء ہلاک ہو گئے اور تعلیم حق پھیل گئی۔ عموماً یہ ذکر مکی سورتوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ جہاں نبی کریم ﷺ کی کامیابی کا کسی کو وہم بھی نہ ہو سکتا تھا اور جہاں اعدا کی طاقت کے نیست و نابود ہونے کا کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ پس ان انبیاء علیہم السلام کا ذکر درحقیقت ایک پیشگوئی کے طور پر ہے کہ جس طرح پہلوں کے اعدا تباہ ہو گئے اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کے دشمن بھی تباہ ہو جائیں گے۔

یہاں جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے وہ تاریخی ترتیب سے ہے اور چند نہایت مشہور انبیاء علیہم السلام کا ذکر کر دیا ہے۔ آدم علیہ السلام کا ذکر تو پہلے ضرورت وحی میں آ چکا۔ اب سب سے پہلے نوح علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ عرب کے اردگرد جس قدر نبی ہوئے ان میں سے تاریخی طور پر جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر باقی رہ گیا ہے ان میں حضرت نوح علیہ السلام ہی سب سے پہلے نبی تھے۔ اس لیے ان کے ذکر سے ابتدا کی۔ حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر علاوہ اس موقعہ کے ذیل کے مقامات پر آتا ہے۔

[آل عمران: 33:3]، [الأنعام: 84:6]، [يونس: 71:10-73]، [هود: 25:11-48]، [إبراهيم: 9:14]، [بنى إسرائيل: 3:17]، [الأنبيآء: 76:21-77]، [المؤمنون: 23:23-29]، [الفرقان: 37:25]، [الشعرآء: 105:26-122]، [العنكبوت: 14:29-15]، [الصافات: 75:37-82]، [الذاريات: 46:51]، [النجم: 52:53]، [القمر: 9:54-16]، [التحريم: 10:66]، [الحاقة: 11:69-12]، [نوح71]۔

1102 - بتایا کہ رسول میں ضلالت نہیں ہو سکتی۔ **عصمت انبیاء علیہم السلام** پر قرآن کریم کی یہ شہادت بھی کافی ہے۔

1103 - اَنْصَحُ۔ نُصْحٌ ایسے فعل یا قول کا قصد ہے جس میں دوسرے کی صلاحیت یا بھلائی ہو اور اسی سے نَاصِحٌ ہے اور نُصْحٌ کے اصل

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾

اور کیا تم تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک شخص کے ذریعہ سے نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم تقویٰ کرو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع 8 6 15

پر انہوں نے اس کو جھٹلایا سو ہم نے اسے اور انہیں جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے بچالیا اور انہیں غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ اندھی قوم تھی۔ (1104)

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے سوائے اس کے کوئی معبود نہیں۔ پس کیا تم تقویٰ اختیار نہ کرو گے۔ (1105)

معنی ہیں خالص کیا، اسی سے ہے ﴿تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾ [التحریم: 8:66] یعنی خالص توبہ۔

1104 - **طوفانِ نوح:** طوفان نوح کے متعلق مفصل ذکر آگے آئے گا لیکن کلام پاک کے یہ الفاظ ﴿وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ صاف بتاتے ہیں کہ صرف وہی لوگ غرق ہوئے جن کی طرف حضرت نوح علیہ السلام پیغام لائے اور جنہوں نے آپ کو جھوٹا کہا اور آپ کی مخالفت کی اور حضرت نوح علیہ السلام کا پیغام صرف اپنی قوم کی طرف تھا جیسا کہ [آیت نمبر: 59] سے ظاہر ہے نہ کل عالم کی طرف۔ اس سے سارے عالم پر محیط ہونے والے طوفان کا خیال غلط ٹھہرتا ہے۔

1105 - نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد بلحاظ ترتیب زمانی عاد کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک بڑی زبردست قوم تھی جو عرب کے جنوب میں الاحقاف میں آباد تھی اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا عروج اس قدر ہو گیا تھا کہ یہاں سے نکل کر انہوں نے بہت سے ملکوں پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ خود عاد جس کے نام پر اس قوم کا نام ہوا ارم کا پوتا تھا۔ جو نوح علیہ السلام کا پوتا تھا اور اس قوم کو بعض وقت عاد اولیٰ بھی کہا جاتا ہے اور ثمود کو جو اس قوم کی ایک شاخ تھی عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس قوم کے تاریخی نشانات اور کتبے بھی ملے ہیں۔ انہوں نے اپنے چار دیوی قرار دیئے ہوئے تھے۔ ساقیہ، حافظہ، رازقہ، سالمہ یعنی بارش کی دیوی، دشمنوں سے بچانے والی دیوی، رزق کی دیوی، صحت کی دیوی۔ حضرت ہود علیہ السلام کو جو ان کی طرف مبعوث ہوئے ان کا بھائی اسی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے کہا ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

اس کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہا ہم تجھے بے وقوف دیکھتے ہیں اور ہم تجھے جھوٹوں میں سے سمجھتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾

اس نے کہا اے میری قوم! مجھ میں بیوقوفی کوئی نہیں لیکن جہانوں کے رب کا رسول ہوں۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾

میں تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔ (1106)

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور کیا تم تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ہی ایک شخص کے ذریعہ سے نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے۔ اور یاد کرو جب اس نے تم کو نوح کی قوم کے بعد بادشاہ بنایا اور تم کو پیدائش میں قوت میں بڑھایا سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ (1107)

عاد کا ذکر علاوہ اس واقعہ کے ذیل کے مقامات پر ہے: [هود: 11:50-60]،[إبراهيم: 9:14]،[الفرقان: 38:25]، [الشعرآء: 123:26-140]،[العنكبوت: 38:29]،[حٰمٓ: 41:13-16]،[الأحقاف: 46:21-26]،[الذاريات: 51:41-42]،[النجم: 53:50]،[القمر: 54:18-21]،[الحاقة: 69:4 ,6-8]،[الفجر: 89:6-8]۔

1106 - اَمِيْنٌ۔ اَمْنٌ طمانیت نفس کا نام ہے اور امین وہ ہے جس کے متعلق ایسی طمانیت نفس حاصل ہو۔ (غ) پس امین وہ ہے جو ایسی ہر طرح کی خوبیوں سے متصف ہو کہ اس کے متعلق سب کو طمانیت نفس حاصل ہو اور چونکہ اَمَانَةٌ کا لفظ بھی ان تمام فرائض پر بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ذمہ رکھے ہیں۔ (ل) اس لیے امین وہ ہے جو تمام فرائض انسانی کو ادا کرنے والا ہو۔ ایک رسول کو امین یعنی ہر طرح سے راستباز قرار دے کر تمام رسولوں کی عصمت کے اصول کو بیان کر دیا۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ حضرت ہود علیہ السلام تو امین تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام امین نہ تھے اس لیے کہ ان کے متعلق یہ لفظ قرآن شریف میں نہیں آیا۔

1107 - بَصْۜطَةً۔ بَسْطٌ سے ہے جس کے معنی فراخی ہیں۔ (غ) ﴿وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ﴾ [البقرة: 2:247] ''اور علم اور جسم

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور اس کو چھوڑ دیں جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ تو ہم پر لے آ جو تُو ہمیں وعدہ دیتا ہے اگر تو سچوں میں سے ہے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

اس نے کہا یقیناً تمہارے رب کی طرف سے تم پر پلیدی اور ناراضگی آ چکی۔ کیا تم میرے ساتھ (ان) ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری سو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ (1108)

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ مَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ع 9 8 16

سو ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ مومن نہ تھے۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ وقف لازم

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا (1109) (اس

میں اس کو بہت بڑھایا۔'' اور بَسْطَةً یا بَصْطَةً سے مراد قوت اور زیادتی جسم ہے۔

الْخَلْقِ سے مراد اِبْدَاعٌ یعنی پیدائش یا بناوٹ بھی ہو سکتی ہے اور مخلوق بھی۔

قوم عاد قوت میں اور غالباً قوت جسمانی میں بھی اپنے ہم عصروں پر فوقیت لے گئی تھی اور بڑے حصہ دنیا کو اپنی قوت سے اپنے تصرف میں کر لیا تھا۔

1108 - اَسْمَآءٌ کے لفظ میں ان دیوتاؤں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے اپنے لیے مقرر کر رکھے تھے [دیکھو نمبر: 1105]۔ ان کو محض نام کہا ہے جن کے نیچے حقیقت کوئی نہیں۔

1109 - قوم ثمود جو ارم کے دوسرے پوتے کے نام سے مشہور ہوئی قوم عاد سے قریبی تعلق رکھتی ہے مگر عاد کے دو سو سال بعد ان کا عروج

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

نے) کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی دلیل آ چکی۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشان ہے سو اس کو چھوڑ دو۔ اللہ کی زمین میں چرے اور اس کو کوئی دکھ نہ پہنچاؤ ورنہ تمہیں دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ (1110)

ہوا۔ یہ قوم مدینہ کے شمال میں الحجر کے علاقہ میں آباد تھی جو پہاڑی علاقہ ہے۔ بعض نے کہا کہ ثمود ان کا نام ثَمَدٌ سے ہے جس کے معنی قلیل پانی ہیں جس کا مادہ کوئی نہ ہو۔ (غ) یہ پہاڑی علاقہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ بارش کا پانی اکٹھا کر کے گزارہ کرتے تھے اور چشموں کی بہت قلت تھی۔ اس قوم کا ذکر علاوہ اس موقعہ کے ذیل کے مقامات پر ہوا ہے۔ [هود: 11:61-68]، [إبراهيم: 9:14]، [الحجر: 15:80-84]، [الفرقان: 25:38]، [الشعرآء: 26:141-159]، [النمل: 27:45-53]، [العنكبوت: 29:38]، [حٰمٓ: 41:13-14, 17-18]، [الذاريات: 51:43-45]، [النجم: 53:51]، [القمر: 54:23-31]، [الحاقة: 69:4-5]، [الفجر: 89:9]، [الشمس: 91:11-15]۔

1110- ﴿نَاقَةُ اللّٰهِ﴾ یہ اضافت محض تعظیم کے لیے ہے جیسے بیت اللہ میں اور ادنیٰ ملابست کی اضافت ہے۔ کیونکہ اللہ کی طرف سے وہ اونٹنی بطور نشان قرار دی گئی کہ جو کوئی اس کو مارے گا وہ خود تباہ کر دیا جائے گا۔ جس طرح بیت اللہ کو ایک نشان قرار دیا گیا جو کوئی اس کو برباد کرنا چاہے وہ خود برباد کر دیا جائے گا۔ باقی باتیں یہ کہ اونٹنی پتھر سے پیدا ہوئی تھی اور تنہا ساری قوم کا پانی پی جاتی تھی محض قصے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ اونٹنی کا نشان تکذیب کے بعد دیا گیا اور وہ عذاب کے آنے کے لیے محض ایک نشان کے طور پر تھا جیسا کہ ﴿جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ سے ظاہر ہے یعنی حق کی دلائل تو آ چکیں۔ مگر چونکہ ان دلائل کی پروا نہیں کی اس لیے اب عذاب آتا ہے۔ یہ ذکر زیادہ تفصیل سے سورۂ ہود میں اور سورۂ شعراء میں موجود ہے۔ اور مؤخر الذکر سورت میں لمبی بحث کے بعد وہ خود نشان مانگتے ہیں ﴿فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [الشعراء: 26:154] ''سو کوئی نشان لا اگر تو سچوں میں سے ہے۔'' اور اس اونٹنی کے مارنے میں بھی درحقیقت ایک تمہید معلوم ہوتی ہے کہ اس کے بعد وہ خود حضرت صالح علیہ السلام کو مارنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف ان کی سازش کا ذکر سورہ [النمل: 27:48-49] میں موجود ہے کہ آپ کے اور آپ کے سب ساتھیوں کو قتل کرنے کا منصوبہ وہ کر چکے تھے ﴿لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ﴾ پس اس اونٹنی کا مار دینا آخری نشان تھا کہ اب وہ حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کر دیں گے اور حضرت صالح علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ اسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں چرے یا یہ کہ اس کو بھی پانی پینے دو، یہ بتانے کو تھا کہ اگر تمہیں عداوت ہے تو مجھ سے ہے ایک بے زبان جانور کو دکھ نہ پہنچاؤ۔

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں ٹھکانا دیا تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر کوٹھیاں بناتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرو۔ (1111)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

سرداروں نے جنہوں نے اس کی قوم میں سے تکبر کیا۔ ان سے جو کمزور تھے جو ان میں سے ایمان لائے۔ کہا کیا تم جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے؟ بولے جو کچھ اسے دے کر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لانے والے ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

جو متکبر تھے بولے، جس پر تم ایمان لائے ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾

پس انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہا اے صالح! لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر تو پیغمبروں میں سے ہے۔ (1112)

1111 - سُهُوْلِ۔ سَهْلٌ کی جمع ہے۔ سہولت یا آسانی اور سَهْلٌ صاف اور ہموار زمین کو کہتے ہیں جو حُزْنٌ کی ضد ہے یعنی اونچی نیچی زمین۔ (غ)

اٰلَآءَ۔ مادہ اَلٰی ہے اور اس کے معنی نعمتیں ہیں واحد اَلًی یا اِلًی ہے۔ (غ)

تَنْحِتُوْنَ۔ نَحَتَ لکڑی یا پتھر اور سخت اجسام کے تراشنے پر بولا جاتا ہے۔

1112 - عَقَرُوْا۔ عَقَرَ کسی چیز کا اصل ہے اور عَقَرْتُهٗ کے معنی ہیں اس کے اصل یا سر کو کاٹ دیا اور کھجور کا عَقَرَ اس کا کاٹ دینا اور اونٹ کا عَقَرٌ اس کا ذبح کرنا یا مار دینا ہے۔ (غ)

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾

سو ان کو زلزلہ نے آ پکڑا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ (1113)

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

پس اس نے ان سے منہ پھیرا اور کہا اے میری قوم! یقیناً میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہارا بھلا چاہا لیکن تم خیر خواہوں کو دوست نہیں رکھتے۔ (1114)

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾

اور لوط کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلی قوموں میں سے کسی نے نہیں کی۔ (1115)

1113- الرَّجْفَةُ۔ رَجْفٌ اضطراب شدید کو کہتے ہیں ﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ﴾ [المزمل: 14:73] ''جس دن زمین اور پہاڑ کانپ اٹھیں گے۔'' ﴿تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ﴾ [النازعات: 6:79] ''کانپنے والی کانپ اٹھے گی۔'' اور اِرْجَافٌ کے معنی ہیں اضطراب شدید میں ڈال دینا قول سے ہو یا فعل سے ﴿وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ﴾ [الأحزاب: 60:33] ''اور مدینہ میں بری خبر اڑانے والے۔'' اور رَجْفَةُ زلزلہ ہے۔ جٰثِمِيْنَ۔ جَثَمَ پرند کے متعلق کہا جاتا ہے جب وہ زمین پر بیٹھ جائے اور اس سے لگ جائے۔ پس جٰثِمِيْنَ سے مراد ہے جہاں وہ تھے وہیں رہ گئے۔ (غ) جیسا زلزلہ میں لوگ دب کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں الرَّجْفَةُ کا لفظ استعمال کر کے صاف بتا دیا کہ ثمود کی قوم کا عذاب بھونچال تھا۔ صَيْحَةٌ، صَاعِقَةٌ وغیرہ سب نام زلزلہ پر صادق آتے ہیں۔ کیونکہ سخت زلزلہ کے ساتھ خطرناک آواز بھی ہوتی ہے۔

1114- چونکہ اعدائے حق کی عادت ہمیشہ یہی چلی آئی ہے اور اس وقت بھی مخالفین حق کی یہی حالت ہے جیسے آج بھی ہے، اس لیے استمرار کو ظاہر کرنے کے لیے مضارع استعمال کیا۔

1115- ترتیب زمانی کے لحاظ سے ثمود کے بعد ابراہیم علیہ السلام کا ذکر چاہیے تھا مگر اس ذکر کو بالکل چھوڑ کر لوط علیہ السلام کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر پہلے الگ سورۃ الانعام میں کر دیا گیا ہے اور یہ علیحدہ ذکر بھی بلا وجہ نہیں۔ جس قدر انبیاء علیہم السلام کا یہاں ذکر کیا ہے وہ اس غرض کے لیے ہے کہ بتایا جائے کہ ان کے اعدا ہلاک ہو گئے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن کی قوم پر ایسے عذاب کے آنے کا کوئی ذکر نہیں ان انبیاء علیہم السلام سے الگ کر دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعدا کے ساتھ سلوک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعدا والا ہوا یعنی ان کو تباہ نہیں کیا گیا۔ مگر ان کی قوت توڑ کر ان کا استیصال کر کے ایک رنگ میں دوسرے انبیاء علیہم السلام کے اعدا کے ساتھ ان کو شامل کر دیا۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے آتے ہو۔ بلکہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔

وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور اس کی قوم کا جواب کچھ نہ تھا مگر یہ کہ انہوں نے کہا ان کو اپنی بستی سے نکال دو یہ وہ لوگ ہیں جو پاک بنتے ہیں۔ (1116)

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ كَانَتْ

سو ہم نے اسے اور اس کے اہل کو بچا لیا مگر اس کی عورت

حضرت لوطؑ اور بائبل میں تحریف:

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے مگر علیحدہ قوم کی طرف مبعوث ہوئے یعنی سدومیوں کی طرف۔ بائبل میں جو ذکر لوط کا ہے اس میں حضرت لوط علیہ السلام کو بدترین افعال شنیعہ کا مرتکب بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ [نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ] اپنی بیٹیوں سے ناجائز تعلق کے مرتکب ہوئے۔ مگر جس طرح کئی ایک انبیاء کے متعلق بائبل میں تحریف ہو کر غلط باتیں راہ پا گئیں اسی قسم کی یہ ایک غلطی ہے جو بائبل میں تحریف کو ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ خود سیل نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لوط انبیاء میں سے تھے اور عیسائی اس بارہ میں مجبور ہیں۔ گو بائبل کو تحریف کے الزام سے بچانے کے لیے انکار بھی کر دیں کیونکہ پطرس کی شہادت [2 پطرس: 2:7, 8] میں یوں مرقوم ہے:

''اور راستباز لوط کو جو شریروں کی ناپاک چالوں سے دق ہوا رہائی بخشی کہ وہ راستباز ان میں رہ کر ان کے بے شرع عملوں کو دیکھ سن کے ہر روز اپنے سچے دل کو شکنجے میں کھینچتا تھا۔''

بھلا جو شخص ایسے گندے فعل کا ارتکاب کرے یعنی بیٹیوں سے ناجائز تعلق رکھے وہ راستباز کہلا سکتا ہے اور اس کا دل دوسروں کے اسی قسم کے گندے فعل سے کیوں دکھے گا۔ پس بائبل کو خود بائبل غلط ٹھہراتی ہے اور صحیح فیصلہ قرآن کا ہے کہ لوط علیہ السلام انبیاء میں سے تھے۔ لوط علیہ السلام کا ذکر علاوہ اس مقام کے ذیل کے مقامات پر آیا ہے۔ [الأنعام: 86:6]، [هود: 11:74-83]، [الحجر: 15:58-76]، [الأنبيآء: 21:74-75]، [الشعرآء: 26:160-174]، [النمل: 27:54-58]، [العنكبوت: 29:32-35]، [الصافات: 37:133-138]، [الذاريات: 51:33-37]، [النجم: 53:53-54]، [القمر: 54:33-39]، [التحريم: 66:10]

1116- حضرت لوط علیہ السلام باہر سے آ کر ان کی بستی میں آباد ہوئے تھے۔ یہ محض ان کی اصلاح کے لیے تھا اور حکم خداوندی کے ماتحت آئے تھے۔

مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾

وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی۔(1117)

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ ع 10 12 17

اور ہم نے ان پر ایک مینہ برسایا۔ پس دیکھ مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟(1118)

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا) اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو تمہارے لیے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں یقیناً تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس کھلی دلیل آ چکی۔(1119) سو ماپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ یہ

1117 - اَهْلَ۔ ایک شخص کے اہل میں وہ سب لوگ داخل ہیں جن کو ایک گھر یا ایک نسب یا ایک شہر یا ایک دین جمع کرے۔ (غ) یہاں اَهْلَهٗ سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کے متبع ہی ہیں۔ (ج) اور بلاشبہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کے متبع ہی بچائے جاتے ہیں اور اوپر ﴿اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾ میں حضرت لوط علیہ السلام کے پیروؤں کا ہی ذکر تھا۔

غٰبِرِيْنَ۔ غَابِرٌ اس کو کہا جاتا ہے جو اپنے ساتھیوں کے چلا جانے کے بعد باقی رہ جائے اور غبار وہ ہے جو مٹی اڑانے پر باقی رہ جاتا ہے اسی سے غَبَرَةٌ ہے ﴿عَلَيْهَا غَبَرَةٌ﴾ [عبس: 40:80] ''اُن پر غبار ہوگا'' اور یہ کنایہ ہے غم کی وجہ سے چہرہ پر تغیر آ جانے سے۔ (غ)

1118 - مَطَرٌ مطلق بارش کو کہتے ہیں۔ لیکن مَطَرَ بھلائی میں اور اَمْطَرَ عذاب میں استعمال ہوتا ہے۔ (غ)

یہ بارش کیا تھی؟ اس کا ذکر دوسری جگہ آتا ہے کہ پتھروں کی بارش تھی [هود: 811، الحجر: 74:15] جس سے معلوم ہوا کہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا تھا۔

1119 - شعیب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے پانچویں پشت میں ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر تاریخی ترتیب میں حضرت لوط علیہ السلام کے بعد آیا ہے۔ بائبل میں ہے کہ مدیان ابراہیم کے ایک بیٹے کا نام تھا جو ان کی تیسری بی بی قتورہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ اسی نام کا ایک شہر بحیرہ احمر پر ہے جہاں مدیان کی نسل آباد ہوئی۔ شعیب علیہ السلام کا ذکر ذیل کے مقامات پر بھی آیا ہے۔ [هود: 11:84-95]، [الحجر: 15:78-79]، [الشعرآء: 26:176-191]، [العنكبوت: 29:36-37]۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾	تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مان لو۔(1120)
وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾	اور ہر ایک رستہ پر مت بیٹھو تم ڈراتے ہو، اور اللہ کی راہ سے اسے روکتے ہو جو اس پر ایمان لاتا ہے اور اس میں ٹیڑھا پن چاہتے ہو۔ اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے پھر تم کو بہت کر دیا اور دیکھ لو کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا؟(1121)
وَ اِنْ كَانَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآىِٕفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾	اور اگر تم میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اس پر ایمان لایا ہے جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

1120- كَيْلَ۔ كَيْلٌ (ماضی كَالَ) کے معنی غلہ کا ماپ کر دینا اور [اِكْتَالَ عَلَيْهِ] دوسرے سے ماپ کر لیا ﴿اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ﴾[المطففين: 83:2-3] ''جو جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں، تو اسے پورا کر لیتے ہیں۔ جب انہیں ماپ یا تول کر دیتے ہیں۔'' اور یہ گو ماپ میں خاص ہے مگر مراد تمام معاملات میں جہاں لینا یا دینا ہو انصاف کا مدنظر رکھنا ہے اور ﴿كَيْلَ بَعِيْرٍ﴾[یوسف: 12:65] سے مراد مقدار ﴿حِمْلُ بَعِيْرٍ﴾[یوسف: 12:72] ہے یعنی اونٹ کے بوجھ کی مقدار ﴿فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ﴾[یوسف: 12:63] ''اس لیے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں کہ ہم غلہ لائیں۔'' (غ)

مِيْزَانَ۔ [دیکھو نمبر: 1050]۔ اور وزن کرنا یا وزن یا میزان کا قائم کرنا عام ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ تمام اقوال و افعال میں جنہیں انسان مدنظر رکھتا ہے عدل کی رعایت ملحوظ رکھے۔ (غ)

تَبْخَسُوا۔ بَخْسٍ تھوڑی ناقص چیز کو کہتے ہیں ﴿وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ﴾[یوسف: 12:20] ''اور اسے تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالا'' اور ظلم کے طریق پر کسی چیز کے کم کرنے کو کہا جاتا ہے۔ (غ)

1121- رستوں میں بیٹھنا حقیقی معنی میں بھی ہوسکتا ہے یعنی ڈاکہ مارنے کے معنی میں۔ جیسے قطع طریق آتا ہے اور مجازی معنی میں بھی۔ یعنی مراد اس سے صرف لوگوں کا روکنا ہو اور ﴿بِكُلِّ صِرَاطٍ﴾ سے مراد ہر ایک حق کا رستہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اعداء بھی ایسا ہی کرتے تھے اور انہی کی طرف اشارہ کرنے کو اس کا ذکر کیا۔